ہندستان کے تہترویں جشن جمہوریت کے پرمسرت موقع پر

ہفت روزہ
الجمعیۃ
نئی دہلی

کا

جمہوریت نمبر

ترتیب و پیشکش
محمد سالم جامعی
خادم ادارۂ تحریر ہفت روزہ الجمعیۃ، دہلی

قیمت
پانچ روپے

جلد: ۳۵
شمارہ: ۳

۲۱ر تا ۲۷ر جنوری ۲۰۲۲ء — ۱۷ر تا ۲۳ر جمادی الثانی ۱۴۴۳ھ
Year-35 Issue-3 21 - 27January 2022 Page 16

اندر پڑھیے

- مہاتما گاندھی اوران کا قومی اتحاد کا نظریہ ہے ہندستان میں جمہوریت کی بنیاد ص۴
- جمہوری ہندستان میں افسپا قانون: ضرورت ہے یا ظلم وجبر کی علامت ص۶
- جمہوریت میں اقلیت واکثریت نہیں اعمال فیصلہ کن ہوتے ہیں ص۹
- ہندستان میں ہچکولے کھاتی جمہوریت ملک کے مستقبل کیلئے لمحہ فکریہ ص۱۲
- جمہوریت میں قیادت ونمائندگی کے مسئلہ پر خصوصی توجہ کی ضرورت ص۵
- جمہوری ہندستان میں آر ایس ایس کا ہندو راشٹر کا منصوبہ ص۸
- اعمال فیصلہ کن ہوتے ہیں ایک شرعی فریضہ بھی ہے اور ملّی ضرورت بھی ص۱۰
- ہندستان میں جمہوریت ہی نہیں سیکولرزم بھی دم توڑ رہا ہے ص۱۳

سوڈان: کیا فوجی حکمراں جمہوریت کا وعدہ پورا کریں گے

براعظم افریقہ کے ایک مسلم ملک سوڈان میں موجودہ سیاسی اور اقتصادی بحران ختم کرنے کی کوشش پھر سے شروع ہوئی ہے۔سوڈان کے صدر نے ۲۰۱۸ء کے آخر میں بحران کو ختم کرنے کے لیے سرکاری خرچ کو کم کرنے کے لیے چند تدابیر نافذ کی تھیں، جس کا براہِ راست اثر عام آدمی کی روزمرہ کی زندگی، روزی روٹی اور پٹرولیم کی قیمتوں میں اضافے پر پڑا اور عوامی ناراضگی اس قدر بڑھی کہ صدر بشیر کو بے دخل کرنے کا مطالبہ شروع ہوگیا اور ناراض لوگوں نے فوج کے ہیڈکوارٹر کو گھیر کر ۳۰ سال سے زیادہ مدت سے اقتدار پر قابض بشیر کو ہٹانے کے لیے فوج پر دباؤ بنایا۔ چھ دنوں کے محاصرے کے بعد فوج نے اعلان کردیا کہ صدر کو اقتدار سے بے دخل کردیا گیا۔ ۱۱راپریل ۲۰۱۹ء کو سات رکنی ملٹری کونسل کے لیفٹیننٹ جنرل عبدالفتح عبدالرحمٰن برہان نے حکومت کا انتظام وانصرام سنبھالا۔

کون ھیں عمر البشیر

ایک پیشہ ورفوجی عمرالبشیر نے ۱۹۸۹ء میں تختہ پلٹ کر حکومت قائم کی اور اسلامی قانون نافذ کیا۔عمرالبشیر نے سلفی اسلامی قوانین نافذ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سوڈان کے کئی مشہور شعرا اور موسیقاروں کو ملک چھوڑنا پڑا۔سوڈان موسیقی میں منفرد مقام رکھتا ہے۔اسلامی قوانین کے نفاذ کے بعد روایتی موسیقاروں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔خواتین کو مغربی لباس سے اجتناب کرنا پڑا۔ دراصل اسلامی قوانین نافذ کرکے اس کی آڑ میں عمرالبشیر کو اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرنے اور حریفوں کو صاف کرنے کا موقع ملا۔سوڈان میں ۱۹۸۹ء کی بغاوت کے بعد سیاسی پارٹیوں اور اخباروں اور صحافیوں پر بھی پابندیاں عائد کردی گئیں۔ یہ اقتدار ۲۰۱۹ء تک اسی طرح چلتا رہا مگر دسمبر ۲۰۱۸ء میں مہنگائی میں بے تحاشہ اضافہ کے سبب تیس سال سے قابض عمرالبشیر کو اقتدار چھوڑنا پڑا۔سوڈان مسلح افواج نے تین مہینے کے لیے ایمرجنسی کا اعلان کردیا۔فوج اور مظاہرین کے درمیان تصادم میں تقریباً سو افراد کی موت ہوئی۔اس واقعہ کو خرطوم قتل عام کہا جاتا ہے۔ جمہوریت کے قیام کے لیے عورتوں اور نوجوانوں نے انتہائی اہم رول ادا کیا اور بظاہر ایک روایتی سماج سے روشن خیال اور ایک تعلیم یافتہ قیادت سامنے آئی،اس میں خواتین کے سرگرم رول نے جمہوری تحریک کو نئی سمت دی۔

دراصل سوڈان مظاہرین کا مطالبہ ہے کہ فوج اور اس کے حوارین اقتدار پر قابض نہ ہوں اور ملک میں حقیقی جمہوری نظام نافذ کیا جائے اور آئین سازی کا عمل شروع ہو۔ پرامن مگر زبردست عوامی تحریک کے نتیجے میں جولائی ۲۰۱۹ء میں جمہوریت پسند مظاہرین اور فوج کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا۔

سوڈان میں فوج کے منہ کو اقتدار کا خون لگا ہوا ہے۔ ۲۱رستمبر ۲۰۲۱ء کو ایک اور بغاوت ہوئی جس میں فوج کے چالیس افسران کو گرفتار کیا گیا۔ بعدازاں ایک اور بغاوت ۲۵راکتوبر ۲۰۲۱ء کو ہوئی اور عوامی عبوری سرکار کے وزیراعظم عبداللہ حمدوک کو گرفتار کیا گیا اور جنرل عبدالفتح البرہان نے اقتدار پر قبضہ کرکے ایمرجنسی لگادی۔

۲۱رنومبر ۲۰۲۱ء کو حمدوک کو دوبارہ وزیراعظم کے عہدے پر فائز کردیا گیا۔ فوج نے سویلین حکومت کے ساتھ سمجھوتہ کیا اور چودہ نکات پر مشتمل مطالبات پر اتفاق ہوا جس کے تحت تمام سیاسی قیدیوں کو آزاد کرنا اور ۲۰۱۹ء کے آئینی علانیہ کی بنیاد پر سیاسی تبدیلیوں کی روشنی میں بات طے ہوئی۔

سوڈان میں فوج اور سویلین حکومت اور سیاسی قیادت میں رسہ کشی جاری ہے اور دیکھنا ہے کہ آخراونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔□□

سوڈان- تاریخ وار ایک اجمالی جائزہ

۱۹۵۸ء:	ایک سال قبل منتخب سرکار کو جنرل ابراہیم نے بے دخل کیا۔
۱۹۶۲ء:	خانہ جنگی کی شروعات۔
۱۹۶۴ء:	اکتوبر کے انقلاب میں اسلام پسند اقتدار میں آئے۔
۱۹۶۹ء:	جعفرنمیری نے فوجی بغاوت کی قیادت کی۔
۱۹۷۸ء:	جنوبی سوڈان میں پٹرول کے ذخائر دریافت ہوئے۔
۱۹۸۳ء:	جنوبی سوڈان میں خانہ جنگی پھوٹ پڑی۔نمیری کی قیادت میں اسلامی قوانین کا نفاذ۔
۱۹۸۵ء:	نمیری اقتدار سے بے دخل ہوئے۔
۱۹۸۹ء:	فوج کی بغاوت، این ایس آر اقتدار میں آئی۔
۱۹۹۳ء:	جنرل عمرالبشیر صدر بنائے گئے۔
جولائی ۲۰۱۱ء:	جنوبی سوڈان ایک علیحدہ ملک کے طور پر معرضِ وجود میں آیا۔
۲۰۱۹ء:	بدنظمی اور اپنے خلاف ناراضگی ختم کرنے کے لیے عمرالبشیر نے ایمرجنسی کا اعلان کردیا۔
اپریل ۲۰۱۹ء:	قیمتوں میں اضافے کے بعد صدر عمرالبشیر اقتدار سے بے دخل۔
ستمبر ۲۰۱۹ء:	عبوری حکومت میں وزیراعظم عبداللہ حمدوک تین سال کے لیے بنائے گئے۔ٹرانزیشن گورنمنٹ بنائی گئی۔اس سرکار میں جمہوریت پسند مظاہرین، سیاسی جماعتوں اور فوج کی نمائندگی ہے۔

سوڈان: ایک تعارف

براعظم افریقہ کے شمال مشرقی حصے میں واقع سوڈان رقبہ کے حساب سے تیسرا سب سے بڑا ملک ہے۔اس کی سرحد سینٹرل افریقن ریپبلک (سی اے آر) جنوبی سوڈان سے ملتی ہے۔ چاڈ، مصر، اریٹیریا، ایتھوپیا، تیسا اور بحراحمر سے بھی ایک بڑا حصہ ملتا ہے۔ایک طویل خانہ جنگی کے بعد ۲۰۱۱ء میں سوڈان سے ایک الگ ملک جنوبی سوڈان معرضِ وجود میں آیا۔سوڈان عرب لیگ کا ممبر ملک ہے اور وادی نیل کا ملک جس کی قدیم تاریخ فرعون کے دور سے جا کر ملتی ہے۔سوڈان میں مصر کے اہرام کی طرح اہرام پائے جاتے ہیں اور قدیم مصر کی تہذیب کے اثرات قرب وجوار کے ممالک میں کافی پائے جاتے ہیں۔خاص طور پر ان ممالک میں جن کو نیل کی وادی سے سیراب ہونے والا ملک کیا جاتا ہے۔

خرطوم دریائے نیل کا سنگم

سوڈان کی راجدھانی خرطوم کا لفظی ترجمہ ہاتھی کے دانت ہیں مگر اس کو مثلث راجدھانی (Triangular Capital) بھی کہتے ہیں۔ مثلث اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں دریائے نیل (نیلا) اور دریائے نیل (سفید) ملتے ہیں اور ایک مثلث نما شکل اختیار کرتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں دو دریا ملتے ہیں یعنی سفید اور نیلے دریا (نیل) کا سنگم ہے۔

سفید پوش خاتون- الاصلاح

سوڈان میں ۲۰۱۹ء کے اواخر سے جاری احتجاجوں کو اس وقت جلا ملی جب ایک سفید پوش خاتون نے کار کی چھت پر کھڑی ہوکر مقتدر طبقہ کے استبداد کے خلاف انقلاب برپا کردیا۔ صلاح سفید پوش سوڈان کی بااختیار تعلیم یافتہ اور خودمختار عورت کی علامت کے طور پر اُبھریں۔ غروب ہوتے ہوئے سورج اور آسمان کی طرف اشارہ کرتی ہوئی نوعمر الاصلاح کو دنیا بھر میں لیڈی لبرٹی کہہ کر پکارا گیا۔ اپریل ۲۰۱۹ء کو لیا گیا یہ فوٹو ان کو ۲۰راکتوبر ۲۰۱۹ء میں اقوامِ متحدہ کی سیکورٹی کونسل لے گیا جہاں انھوں نے سوڈان کے مجوزہ نئے نظام میں خواتین کے یکساں اختیارات کی بات کہی۔

جمہوری رہنما آمریت کے خلاف مزید فعال ہوں: ہیومن رائٹس واچ

ہیومن رائٹس واچ کے ترجمان کینتھ روتھ نے ۱۳رجنوری کو ایک بین الاقوامی خبررساں ادارے کو دیے گئے، اپنے بیان میں کہا ہے کہ جمہوری حکمرانوں کی جانب سے جمہوری اقدار اور حقوق کی موثر حمایت کرنے میں ناکامی ہی دنیا میں بڑھتے ہوئے آمرانہ رویے کو فروغ دینے کا سبب بنی ہے۔انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ جمہوری طور پر منتخب لیڈران کی طرف سے کورونا وبا کے سبب بڑھتی ہوئی بے چینی اور موسمیاتی تبدیلیوں جیسے عالمی چیلنجز کے مقابلے میں جرأت مندانہ اور اصولی قیادت دکھانے کی اشد ضرورت ہے۔ ہیومن رائٹس واچ کے ایگزیکٹیوڈائریکٹر کا کہنا ہے کہ وہ اس بات سے خائف ہیں کہ اگر جمہوری حکمرانوں نے اپنی آواز بلند نہیں کی، جو کہ وقت کی اشد ضرورت ہے، تو یہ دنیا بھر میں مایوسی اور اضطراب کا باعث بنے گا اور اس سے آمریت کی سوچ کو فروغ ملے گا۔ ۷۵۰ صفحات پر مشتمل سالانہ رپورٹ میں چین، روس، بیلاروس اور مصر جیسے ممالک میں مخالفین کی آوازوں کے خلاف ہونے والی کاروائیوں سے متعلق حقائق درج ہیں نیز میانمار اور سوڈان سمیت دنیا بھر میں ہونے والی حالیہ فوجی بغاوتوں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے اور ان ممالک میں آمرانہ رجحانات کے حامی حکمرانوں کے ابھر کر سامنے آنے پر خدشات کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اس رپورٹ میں ان ممالک کا تذکرہ بھی ہے جو کہ کبھی جمہوری سمجھے جاتے تھے لیکن پچھلے چند سالوں میں وہاں بھی آمرانہ سوچ کے حامی لیڈر سامنے آئے ہیں۔ان ممالک میں ہنگری، پولینڈ، برازیل اور پچھلے سال تک، امریکا بھی شامل ہے۔ روتھ کا کہنا ہے کہ حالانکہ امریکا میں اس وقت جمہوری قیادت ہے لیکن سابق صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی جانب سے ۲۰۲۰ء کے انتخابات کے نتائج تبدیل کرنے کی کوششوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ میں جمہوری حکومت کے قیام پر اب تک سوالیہ نشان لگا ہے۔انہوں نے کہا کہ ٹرمپ کے حامیوں کی طرف سے گزشتہ سال کیپٹل ہل پر دھاوا بولنے اور وہاں ہونے والی ہنگامہ آرائی 'واقعی صرف شروعات تھی'۔ انہوں نے کہا کہ انہیں خدشہ ہے کہ ۶رجنوری کو واشنگٹن ڈی سی میں ہنگامہ آرائی 'انتخابات کے نتائج کو رد کرنے اور اسے سبوتاژ کرنے کی کوشش تھی' اور اب بھی ایسی ڈھکی چھپی کوششیں جاری ہیں جن کا مقصد اگلے صدارتی انتخابات پر اثر انداز ہونا ہے۔

دریچۂ پاکستان

وجاہت مسعود

جمہوریت کے بغیر پائیدار انسانی ترقی ممکن نہیں

انسانی معاشرہ ایک پیچیدہ، متنوع، سیال اور اکثر ناقابل پیش بینی مظہر ہے۔اس میں آبادی کے مختلف حصوں میں ناگزیر طور پر مفادات کا ٹکراؤ بھی پایا جاتا ہے اور قدرتی عناصر کی بے اماں مداخلت بھی۔تاریخ ایک اثاثہ بھی ہوسکتی ہے اور اجتماعی نفسیات میں گہرا گھاؤ بھی۔کہیں معدنیات کی فراوانی کے باوجود کانگو کی معیشت کا کل حجم اسّی ارب ڈالر اور فی کس آمدنی بمشکل ۹۰۰ ڈالر ہوتی ہے اور کہیں جرمنی اور جاپان جیسے ممالک معدنیات نہ ہوتے ہوئے بھی ترقی یافتہ اور امیر ترین ممالک میں شمار ہوتے ہیں۔ رقبے اور معدنیات کے لحاظ سے وسطی ایشیا کا سب سے بڑا ملک قزاقستان سیاسی عدم استحکام کا شکار ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر نجیب اللہ مرحوم اپنے ملک کے بارے میں ایک کاٹ دار جملہ کہا کرتے تھے، 'افغانستان کی تاریخ بہت شاندار ہے اور جغرافیہ بدقسمت'۔ جغرافیے کی بدقسمتی کوئی ویت نام والوں سے پوچھے جنہیں چالیس برس تک چین اور کمبوڈیا کی ہمسائیگی کا تاوان ادا کرنا پڑا۔ پہلی عالمی جنگ ختم ہوئی تو کسے اندازہ تھا کہ مشرقِ وسطیٰ میں سلطنت عثمانیہ کے ٹوٹے ہوئے تارے زیرزمین تیل کی بدولت اگلے سو برس خوشحالی کا ڈنکا بجائیں گے۔ اور پھر معدنی تیل کی اہمیت ختم ہونے کا امکان پیدا ہوتے ہی اسرائیل کو گلے بھی لگائیں گے اور بحیرہ احمر کے ساحلوں پر کوڑا بردار خدائی فوجداروں کی جگہ رقص اور موسیقی کے رنگ بھی نظر آئیں گے۔ سابق برما میں جاپان کی فوجی پیش قدمی سے مکانی قربت نے بنگال کو ۱۹۴۳ء کے قحط کا عذاب بخشا۔ چاول کی سوچی سمجھی سرکاری ذخیرہ اندوزی سے پیدا ہونے والے بنگال کے قحط سے ۲۵ لاکھ انسانی اموات، زین العابدین کی مصوری اور کرشن چندر کے دل گداز افسانے ہی برآمد نہیں ہوئے، انسانی فکر کو امرتیوسین کا معاشی فلسفہ بھی نصیب ہوا۔ ۱۹۳۳ء میں ڈھاکہ میں پیدا ہونے والے امرتیوسین نے معیشت کی سائنس کو اخلاق کا لباس بخشا۔اس کا کہنا ہے کہ اپنے معیارِ زندگی میں بہتری کی انسانی آزادی اخلاق کا اعلیٰ ترین درجہ ہے اور جہاں یہ جمہوری آزادی موجود نہ ہو، وہاں انسان قحط سمیت طرح طرح کے آلام کا شکار ہوجاتے ہیں۔ 'بھوکا ہے بنگال رے ساتھی' کا انقلابی گیت سنتے ہوئے شعور کی آنکھ کھولنے والے امرتیوسین نے جمہوریت اور معاشی ترقی کا تعلق دریافت کیا۔ جمہوریت انسانی مساوات، تحفظ اور خوشحالی کا مسرت آگیں تصور ہے لیکن جمہوریت کی تاریخ پیچ دار ہے اور جمہوری ثقافت صبر طلب ہے۔

ڈھائی ہزار برس قبل افلاطون نے ایتھنز کی جمہوری ریاست کی مخالفت کرتے ہوئے فلسفیانہ آمریت کا تصور پیش کیا تھا۔ ازمنہ وسطیٰ کا عہد تاریک ختم ہونے پر آیا تو برطانوی فلسفی تھامس ہابز نے مضبوط مرکزی اقتدار کا تصور پیش کیا۔اس کا کہنا تھا کہ طاقت کے بل پر حکم نافذ کرنے والی مقتدرہ کی عدم موجودگی میں معاشرہ جنگل کے قانون میں بدل جائے گا۔ تھامس ہابز کے ہم وطن اور ہم عصر جان لاک نے اختلافی نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے اس روشن خیالی کی بنیاد رکھی جس نے اٹھارہویں صدی میں روسو اور والٹیئر جیسے جمہور پسندوں کا راستہ ہموار کیا۔ لیکن جمہوریت اپنے جواز کے لئے علم، معیشت اور سماجی شعور کے خاص تقاضے رکھتی ہے۔ بیسویں صدی شروع ہوئی تو دنیا بھر میں ایک دو ممالک کے سوا ہر جگہ غیر جمہوری حکومتیں قائم تھیں۔

برطانیہ اور امریکہ جیسے ممالک میں عورتوں کو ووٹ کا حق نہیں تھا۔ نسلی امتیاز کی لعنت موجود تھی اور دو تہائی انسانیت نوآبادیاتی غلامی میں گرفتار تھی۔ بیسویں صدی ان سنگین چٹانوں سے سر پھوڑتے گزر گئی۔ اسی کی دہائی کے آخری برسوں میں بہت سی امید پیدا ہوئی تھی لیکن سرد جنگ کی باقیات نے سیاسی قدامت پسندی اور دہشت گردی جیسی تحریکوں کی مدد سے انسانی آزادیوں کے خواب کو دھندلا دیا۔ ۲۰۲۱ء میں سامنے آنے والی جمہوری بندوبست کی درجہ بندی میں اقوام متحدہ کے قریب ۹۲ رکن ممالک میں صرف ۲۳ ممالک ایسے ہیں جنہیں موثر، فعال اور مستحکم جمہوریتوں میں شمار کیا گیا ہے اور ان ملکوں میں امریکہ اور بھارت شامل نہیں ہیں۔ جمہوری معیار کے اعتبار سے بلندترین کارکردگی دکھانے والے دس ممالک کے نام دیکھئے، ناروے، آئس لینڈ، سویڈن، نیوزی لینڈ، فن لینڈ، آئرلینڈ، کینیڈا، ڈنمارک، آسٹریلیا اور سوئٹزرلینڈ۔ پانچ ایسے ممالک بھی دیکھ لیجئے جہاں جمہوری آزادیاں بدترین حالت میں ہیں۔ شمالی کوریا، کانگو، سینٹرل افریقن ریپبلک، شام اور چاڈ۔ ہمارے ملک کے ممتاز معیشت دان ڈاکٹر محبوب الحق نے ۱۹۹۰ء میں انسانی ترقی کے انڈیکس کا تصور دیا تھا جس میں متوقع انسانی عمر، شرح خواندگی، صنفی مساوات اور فی کس آمدنی جیسے اشاریے شامل کئے گئے تھے۔ یہ معاشی ترقی کی پیمائش کا ایک انقلابی تصور تھا۔ ایک ذاتی مشاہدہ عرض کروں۔ مشاہدہ کیا ہے، رائیگانی کا ملال کہئے۔ ۱۹۹۲ء میں درویش نے انسانی حقوق کے کارکن کی حیثیت سے عملی کام شروع کیا تو پاکستان انسانی ترقی میں ۱۳۸ر اور بھارت ۱۳۷ نمبر پر تھے۔ اپنے سے چھ گنا بڑے ملک سے صرف ایک درجے کا فاصلہ حوصلہ بندھاتا تھا۔ ۲۰۲۰ء میں انسانی ترقی کی درجہ بندی میں بھارت ۱۳۱ر اور پاکستان ۱۵۴ویں نمبر پر ہے۔ کیسے اجڑی بستیوں کو آباد کروگے؟

ہمارے ملک میں ایسے سجھاؤ دینے والوں کی کمی نہیں جو کبھی صدارتی نظام کا نسخہ پیش کرتے ہیں تو کبھی جمہوریت کا نام لینے والوں کے لئے فائرنگ اسکواڈ کی تجویز دیتے ہیں۔ کوئی خلافت کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے تو کوئی فسطائیت کا قصیدہ لکھتا ہے۔ ایسے مہربانوں سے گزارش ہے کہ جمہوریت اور انسانی ترقی کی درجہ بندیوں میں اعلیٰ اور بدترین کارکردگی دکھانے والے ممالک کی فہرست پر ایک نظر ڈال کر دونوں اشاریوں میں تعلق پر غور کرلیں۔ مغرب (امریکہ) اور مشرق (چین) میں جاری معاشی مسابقت میں اپنے لئے خیراتی ٹکڑوں کی امید رکھنے والوں کو نوید ہو کہ اس برس امریکہ اور چین میں ۷۰۰ رارب ڈالر کی تجارت ہوئی ہے۔ ہم کو شاہوں سے انصاف کی امید نہیں ورنہ انہیں میرؔ صاحب کا شعر سنایا جاتا:

ہر زخم جگر داور محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

ہفت روزہ
الجمعیۃ
نئی دہلی

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

جمہوریت کا تحفظ وقت کی اہم ضرورت

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو جب انگریزوں کی ایک سو سالہ غلامی سے ملک آزاد ہوا اور زمام اقتدار خود ہندستانی لیڈروں کے ہاتھوں میں آئی تو سب سے پہلا سوال جو سامنے آیا وہ یہ تھا کہ ملک کا نظام کیسا ہونا چاہیے؟ ہمارے رہنماؤں کے ہاتھوں میں یہ اقتدار سو سالہ جدوجہد کے بعد آیا تھا۔ اس جدوجہد میں ملک کی تمام قوموں نے مل کر حصہ لیا تھا اور ان تمام مصائب و آلام میں سب برابر کے شریک تھے جو انگریزی سامراج کے ہاتھوں آزادی کے متوالوں نے برداشت کیے تھے اس لیے فطری طور پر سب کی یہ ہی خواہش تھی کہ آئندہ ملک چلانے کے لیے ایک ایسا نظام حکومت ہو جو سب کے لیے ہو اور سب کا ہو اور سب لوگوں کی رائے سے تشکیل پائے۔ یہ تصور امریکہ کے اوّلین صدر ابراہیم لنکن کی جمہوریت پر مبنی حکومت کی تعریف ”عوام کے ذریعہ، عوام کے لیے، عوام کی حکومت“ کے عین مطابق تھا اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندستان کے لیے سب سے موزوں نظام حکومت ”جمہوری نظام“ ہی ہوسکتا ہے پھر جمہوری نظام کے قیام کے لیے ایک جمہوری دستور کی ضرورت ہے۔ اسی جمہوری دستور کی تشکیل کے لیے پہلے قانون ساز اسمبلی وجود میں لائی گئی اور پھر ایک دستور ساز کمیٹی تشکیل دی گئی جس کی صدارت کے لیے معروف دلت ماہر قانون بابا صاحب امبیڈکر کا انتخاب کیا گیا۔ ملک کا یہ جمہوری دستور ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچا اور پھر اسی دستور کے تحت ۱۹۵۲ء کے پہلے عام پارلیمانی انتخابات کا انعقاد عمل میں آیا۔

صحیح بات یہ ہے کہ جمہوریت کا صحیح تصور اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ ایک مثالی جمہوری نظام میں اکثریت کی حیثیت بڑے بھائی کی طرح ہوتی ہے اور اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اقلیتوں میں اعتماد اور بھروسہ کا احساس پیدا کرے تاکہ اقلیتیں قومی بھلائی اور مشترکہ مفاد کے لیے اکثریت سے اشتراک کرکے آگے بڑھ سکیں، ورنہ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ غیر مطمئن اور کچلی ہوئی اقلیتیں اکثر جمہوریت کے لیے خطرہ بن جاتی ہیں جیسا کہ آج کل سری لنکا، فلپائن، آئرلینڈ، صومالیہ اور اسرائیل میں نظر آرہا ہے کہ وہاں کی اقلیت نے اکثریت کا جینا حرام کردیا ہے اس لیے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اکثریتی حکومت کی کامیابی کا راز اقلیتوں کے تحفظ اور خوشحالی میں پوشیدہ ہے جیسا کہ مہاتما گاندھی نے بھی کہا تھا: ”جمہوریت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ کمزور ترین فرد کو انتہائی شہ زور کے مساوی مواقع حاصل ہوں۔“

لیکن ہندوستان میں اکثریت کے بعض طالع آزماؤں نے جمہوریت کو ایک ایسا نظام سمجھ لیا ہے جس میں اکثریت کی مرضی ومنشا کے مطابق حکمرانی کی جاتی ہو حالانکہ یہ جمہوریت کی ایک سطحی اور نامکمل تعریف ہے جس کے ساتھ اسے نظام حکومت تک محدود کردینا مزید نادانی ہے کیونکہ جمہوریت محض ایک طرزِ حکومت کا نام نہیں بلکہ وہ ایک ایسا نظامِ حیات بھی ہے جس میں ہر سطح پر جمہوری اصول و آداب پر عمل کیا جاتا ہو اور جب تک پورا معاشرہ ایسا نہ ہوگا، اس وقت تک حقیقی جمہوریت کا تصور محال رہے گا۔

بدقسمتی سے ہندستان میں آج جمہوریت کے نام لیواؤں، دعویداروں اور پرستاروں کی تعداد جتنی زیادہ ہے جمہوریت پر سچا یقین رکھنے والوں، اس کے حقیقی مفہوم سے روشناس ہونے والوں اور اس پر خلوص دل سے عمل پیرا ہونے والوں کی تعداد اتنی ہی کم ہے اور ایسے لوگ برابر بڑھتے جارہے ہیں جو جمہوریت کو اکثریت کی تاناشاہی سمجھتے یا دوسروں کو سمجھاتے ہیں، جبکہ سچ پوچھا جائے تو ہندستان اقلیتوں کا ملک ہے جہاں مختلف تہذیبوں، رنگوں، نسلوں اور زبانوں کے لوگ بڑی تعداد میں آباد ہیں اور جنھیں بظاہر یکساں حقوق بھی ملے ہوئے ہیں لیکن باریکی سے دیکھا جائے تو عملاً اکثریت کو اوّل درجہ کی شہریت اور قومیت حاصل ہے جبکہ اقلیتیں بے آرامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور ان میں بھی سب سے زیادہ مسائل و مشکلات کا اگر کوئی شکار ہے تو وہ مسلمان اور صرف مسلمان ہیں جن کو پہلے انگریزوں نے اپنی سیاسی مصالح کی وجہ سے ایک صدی تک نظر انداز کیا، اب آزاد ہندستان میں بھی وہ قومی سطح پر مسلسل ستر برس سے حق تلفی کا شکار ہیں۔ چھٹی دہائی میں وزارتِ داخلہ کی طرف سے سینٹر فار ڈیولپنگ سوسائٹیز کے ڈائریکٹر ڈاکٹر گوپال کرشنا نے اس سلسلے میں مسلم معاشرہ کا سروے کیا تو اس کے نتائج کا کمپیوٹر کے ذریعہ تجزیہ کرنے پر یہ چونکا دینے والی بات سامنے آئی تھی کہ مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ذیلی طبقہ میں ان کا معیار ہر شعبہ میں دوسروں کے مقابلہ میں سب سے پست ہے یعنی معیارِ زندگی کے لحاظ سے وہ اچھوتوں سے بھی نیچے پہنچ گئے ہیں، ان کے یہاں تعلیم ترک کرنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، اسی طرح روزگار کی فراہمی یا سرکاری ملازمتوں میں ان کا تناسب اپنی آبادی کے مقابلہ میں کافی نیچے ہے۔ اس سچائی کو سچر کمیٹی کی رپورٹ نے مزید روزِ روشن کی طرح صاف کردیا ہے۔ یوپی اے حکومت نے مسلمانوں کی تعلیمی، اقتصادی، معاشی و سماجی صورتحال جاننے اور اس کے تدارک کے لیے رٹائرڈ جسٹس راجندر سچر کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی تھی جس نے کافی محنت کے بعد ایک رپورٹ تیار کرکے حکومت کو پیش کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ اس وقت مسلمانوں کی معاشی، اقتصادی اور سماجی و تعلیمی حالت دلتوں سے بھی بدتر ہے اس نے اس تعلق سے کچھ سفارشات بھی کی تھیں اور منموہن حکومت نے ان سفارشات کو قبول کرتے ہوئے کارروائی بھی شروع کی تھی مگر اسی دوران ۲۰۱۴ء میں اقتدار تبدیل ہوکر بی جے پی کے ہاتھ میں آگیا اور وزارتِ عظمیٰ پر مسٹر نریندر مودی قابض ہوگئے، آگے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ پھر سچر کمیٹی کی سفارشات کا کیا ہوا۔ مودی جی مہاراج کی قیادت میں بی جے پی حکومت نے وہی کیا جس کی امید تھی، اس نے اسے مسلمانوں کو خوش کرنے والی رپورٹ قرار دے کر ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا اور آج کسی کو یہ بھی خبر نہیں ہے کہ وہ رپورٹ کون سے اندھے غار میں پڑی ہوئی دھول چاٹ رہی ہے۔

بہرحال ہم آج بھی جمہوریت جمہوریت کھیل رہے ہیں مگر جمہوریت آج کہاں اور کس شکل میں ہے، اس کے بہرحال تجزیہ کی ضرورت ہے۔ ہمارے خیال میں آج ہندستان میں جمہوریت اپنی تمام تر مروّجہ اور مسلمہ اقدار کے برخلاف ایک عجیب دوراہے پر کھڑی ہے۔ ایک طرف حزب اختلاف حکومت پر جمہوریت کے قتل کا الزام لگا رہا ہے اور دوسری طرف حکومت ہے جو ملک میں جمہوریت کے پھلنے پھولنے کا دعویٰ کررہی ہے اور اپوزیشن پارٹیوں کو نصیحت کررہی ہے کہ وہ جمہوری طرزِ عمل اپنائے۔ ملک کے سب ہی عوام اپنے سرمائی پارلیمانی اجلاس کا نظارہ دیکھ چکے ہیں جس کے بعد یہ تجزیہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہوگا کہ سچائی کیا ہے۔ حکومت اپوزیشن کے الزامات کو بغض وعناد قرار دے کر مسترد کرسکتی ہے مگر اس کے پاس ان سوالات کا آخر کیا جواب ہے جو ملک کی جمہوریت اور حکومت کے غیر جمہوری طرزِ عمل پر اُٹھائے جارہے ہیں۔ یہ سوالات صرف اپوزیشن پارٹیاں ہی نہیں اُٹھا رہی ہیں بلکہ یہ وہ سوالات ہیں جو عوام کے ذہنوں میں بھی مسلسل پرورش پا رہے ہیں کہ حکومت ایسے قدم کیوں اُٹھا رہی ہے جس کے ثمرات صرف ایک خاص طبقہ تک محدود نظر آرہے ہیں اور آخر جمہوری نظام حکمرانی میں ایک منتخب حکومت کے طرزِ عمل کا جو معیار مقرر ہے اس پر ہماری مرکزی حکومت کیوں کھری نہیں اُتر پا رہی ہے۔ یہ ایسے سوالات ہیں جنھیں آج مودی جی اور ان کے احباب اقتدار کے نشہ میں نظر انداز کرسکتے ہیں مگر جب یومِ حساب آئے گا اس وقت وہ کیا کریں گے انھیں یہ پہلے ہی سوچ لینا چاہیے۔

بہرحال ہم اپنی جمہوریت کی تہترویں سالگرہ منا رہے ہیں جس کے لیے ہم اپنے قارئین کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے امید کرتے ہیں کہ وہ ملک میں جمہوریت کے تحفظ اور اس کی بقاء کے لیے پرامن ور پرخلوص جدوجہد جاری رکھیں گے۔ ◻◻

جواھر القرآن

سورۂ الاحزاب-۳۳ | ترجمہ آیات:۴ | **حضرت شیخ الہندؒ**

○ اللہ نے رکھے نہیں کسی مرد کے دو دل اس کے اندر اور نہیں کیا تمہاری جوروؤں کو جن کو ماں کہہ بیٹھے ہو سچی مائیں تمہاری اور نہیں کیا تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے، یہ تمہاری بات ہے اپنے منہ کی اور اللہ کہتا ہے ٹھیک بات اور وہی سجھاتا ہے راہ (ف ا)

فوائد: —— علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

ف ا یعنی جس طرح ایک آدمی کے سینے میں دو دل نہیں، ایسے ہی ایک شخص کی حقیقتاً دو مائیں یا ایک بیٹے کے دو باپ نہیں ہوتے۔ جاہلیت کے زمانہ میں کوئی بیوی کو ماں کہہ دیتا تو ساری عمر کے لیے اس سے جدا ہوجاتی۔ گویا اس لفظ سے وہ حقیقی ماں بن گئی اور کسی کو منہ بولا بیٹا بنالیتا تو سچ مچ بیٹا سمجھا جاتا تھا اور سب احکام اس پر بیٹے کے جاری ہوتے تھے۔ قرآن کریم نے اس لفظی ومصنوعی تعلق کو حقیقی اور قدرتی تعلق سے جدا کرنے کے لیے ان رسوم ومفروضات کی بڑی شدومد سے تردید فرمائی۔ اس نے بتلایا کہ بیوی کو ماں کہہ دینے سے اگر واقعی وہ ماں بن جاتی ہے تو کیا یہ دو ماؤں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے؟ ایک وہ جس نے اوّل جنا تھا اور دوسری یہ جس کو ماں کہہ کر پکارتا ہے۔ اسی طرح کسی نے زید کو بیٹا بنالیا تو ایک باپ تو اس کا پہلے سے موجود تھا جس کے نطفہ سے پیدا ہوا ہے، کیا واقعی اب یہ ماننا چاہیے کہ یہ دو باپوں سے الگ الگ پیدا ہوا ہے۔ جب ایسا نہیں تو حقیقی ماں باپ اور اولاد کے احکام ان پر جاری نہیں کیے جاسکتے۔ چنانچہ بیوی کو ماں کہنے کا حکم سورہ مجادلہ میں آئے گا اور لے پالک (منہ بولے بیٹے) کا حکم آگے بیان ہوتا ہے۔ ان دو باتوں کے ساتھ تیسری بات (بطور تمہید وتشریح کے) یہ بھی سنادی کہ ایسی باتیں زبان سے کہنے کی بہتیری ہیں جن کی حقیقت واقع میں وہ نہیں ہوتی جو الفاظ میں ادا کی جاتی ہے جیسے کسی غیر مستقل مزاج یا دوغلے آدمی کو یا کسی قوی الحفظ اور قوی القلب کو یا ایسے شخص کو جو ایک وقت میں دو مختلف چیزوں کی طرف متوجہ ہو، کہہ دیتے ہیں کہ اس کے دو دل ہیں حالانکہ سینہ چیر کر دیکھا جائے تو ایک ہی دل نکلے گا۔ اسی طرح ماں کے علاوہ کسی کو ماں یا باپ کے سوا کسی کو باپ یا بیٹے کے سوا کسی کو بیٹا کہہ دینے سے واقع میں وہ نسبت ثابت نہیں ہوجاتی جو بدون ہمارے زبان سے کہے قدرت نے قائم کردی ہے۔ لہٰذا مصنوعی اور حقیقی تعلقات میں غلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔

انوارِ احادیث

- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنے ایمان کو تازہ کرتے رہا کرو۔ عرض کیا گیا: یارسول اللہ! ہم اپنے ایمان کو کس طرح تازہ کریں؟ ارشاد فرمایا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کو کثرت سے کہتے رہا کرو۔ (مسند احمد، طبرانی، ترغیب)
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خطّاب کے بیٹے! جاؤ، لوگوں میں یہ اعلان کردو کہ جنت میں صرف ایمان والے ہی داخل ہوں گے۔ (مسلم)

مہاتما گاندھی اوران کا قومی اتحاد کا نظریہ ہے

ہندوستان میں جمہوریت کی بنیاد

تحریر: عارف عزیز، بھوپال

مہاتما گاندھی ایک عہد ساز بلکہ تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے، اُنھوں نے اپنے قول وفعل، مضبوط عزائم اور اصولوں کی پابندی کا مظاہرہ کرکے ہندوستان کی تقدیر بدلنے کے ساتھ ساتھ دنیا کے کئی دوسرے ملکوں کو بھی غیروں کی غلامی سے آزاد ہونے کی راہ دکھائی ہے۔ گاندھی جی کے اہم کارناموں میں قومی اتحاد، فرقہ وارانہ خیرسگالی، عدم تشدد اور اہنسا کا فلسفہ اِس قابل ہے کہ اُن پر پوری دیانت داری کے ساتھ آج بھی عمل کیا جائے تو ملک کے اندر اور باہر پنپنے والے تشدد اور عدم برداشت کے ماحول کو ہم دور کرسکتے ہیں۔

گاندھی جی کا مسلک تھا کہ ''سرودھرم سمبھاؤ'' یعنی تمام مذہبوں کو پھلنے پھولنے کی آزادی یا ''جیو اور جینے دو'' کا اصول جو آج بھی مختلف گروہوں، قوموں اور ملکوں کے درمیان ہر مسئلہ کے منصفانہ حل اور پائیدار امن کی ضمانت بن سکتا ہے۔ ہم گاندھی جی کی تقریروں کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ انہوں نے ذات، مذہب، علاقائیت، رنگ ونسل اور زبان کی بنیاد پر مختلف طبقوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی، قومی ایکتا کا یہی نظریہ اُن کی فکر کا بنیادی پتھر ہے، جس پر وہ ایک خوشحال قوم کی تعمیر کرنا چاہتے تھے، گاندھی جی کا یہ نظریہ اُس قومی روایت پر مبنی معلوم ہوتا ہے، جس کے مطابق پوری کائنات کو اللہ کا کنبہ قرار دیا گیا ہے۔ ''الخلقُ عیال اللّٰہ'' کی یہی روایت ہندو مذہب کی کتابوں میں بھی مختلف الفاظ کے ساتھ ملتی ہے۔ یہ گاندھی جی کی آفاقی فکر تھی جس نے اُنہیں رنگ ونسل، ذات برادری اور علاقائیت کے امتیازات سے اوپر اُٹھ کر سوچنے کی تحریک دی، انسان دوستی کے اِسی فلسفے نے اُن کے خیالات کو جلا بخشی جس پر وہ آخری دم تک کاربند رہے۔

مہاتما گاندھی کو اِس کا احساس تھا کہ ہندوستان کو اُس وقت تک آزادی نہیں مل سکتی جب تک کہ یہاں رہنے اور بسنے والے دو بڑے فرقے باہم مل جل کر رہنا نہیں سیکھ لیں۔ اگر آزادی مل بھی گئی تو حقیقت میں وہ آزادی نہیں ہوگی، جس کے ہم سب متمنی ہیں۔ گاندھی جی ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے، اُن کا خیال تھا کہ اگر ہندو اور مسلمان امن و بھائی چارہ کے ساتھ زندگی گزارنا نہیں سیکھ لیتے تو اِس ملک کا جسے ہم بھارت کے نام سے جانتے ہیں وجود ختم ہوجائے گا۔ گاندھی جی نے مختلف مذاہب کی کتابوں اور دنیا کے قابل ذکر دانشوروں کے افکار ونظریات کا مطالعہ کیا تھا، اُن کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ ہر صبح گیتا کے ساتھ قرآن مجید اور انجیل مقدس کا مطالعہ کرتے تھے، اُن کی کتاب ''مائی ایکسپریمنٹ وِتھ ٹُروتھ'' میں یہ اعتراف موجود ہے کہ جنوبی افریقہ کے قیام کے دوران کئی مسلمانوں سے اُن کے گہرے مراسم تھے، جو اسلامی تعلیمات سمجھنے میں اُن کے لئے مفید ثابت ہوئے۔ اُن سے جب معلوم کیا گیا کہ 'رام راجیہ' کے جس تصور کی وہ بات کرتے ہیں، وہ کس قسم کی حکومت کے طرز پر ہوگا تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ ''وہ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی حکومت کے طرز پر ہوگا''۔

انگلینڈ کے دورانِ قیام اُنہوں نے عیسائیت اور وکالت کے دوران پارسی لوگوں کے میل جول سے اُن کے مذہب کی روح تک پہوچنے کی سعی کی، وہ تمام مذاہب کو احترام کی گہری نظر سے دیکھتے تھے لیکن اپنے آبائی مذہب یعنی ہندو فلاسفی سے اُن کا گہرا رشتہ تھا، اِسی طرح گاندھی جی نے پورے ہندوستانی سماج کو غائر نظر سے دیکھا اور سمجھا یہاں تک کہ وہ اِس ملک کی سماجی زندگی کے ''نبض آشنا'' بن گئے۔ تحریک آزادی کے دوران تو اُن کا ملک کے ہر طبقہ اور ہر علاقے کے لوگوں سے سابقہ پڑا، یہی وہ عوامل تھے جو اُن کے ''قومی اتحاد'' کے نظریہ کی تشکیل میں مددگار بنے، گاندھی جی کے اِس نظریہ کا تجزیہ کرنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے، یہ اُن کے فطری رجحان کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اُن کے زمانے میں جاری تحریکات اور رجحانات کا تقاضا تھا کہ وہ قومی اتحاد کا سہارا لیکر انگریزوں کی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے تحت ہندو اور مسلمانوں میں نفرت کے جو بیج بوئے گئے ہیں، اُنہیں پھیلنے نہ دیں۔ ۱۹۰۹ء میں مارل منٹو کی اصلاحات سے بھی کشیدگی میں اضافہ ہوا، ہندوؤں اور مسلمانوں میں الگ الگ انتخابی حلقوں کا اعلان، شُدّھی تحریک اور دوقومی نظریہ کا سامنے آنا، یہ وہ عوامل تھے جو آزادی کی تحریک کے لئے زہر ثابت ہوسکتے تھے۔ گاندھی جی نے اِن خطرات کا اندازہ لگاکر اُن سے مقابلہ کے لئے قومی اتحاد کا جھنڈا بلند کردیا، اُنھوں نے نہایت سمجھداری سے کام لے کر ڈاکٹر امبیڈکر اور اعلیٰ طبقہ کے درمیان سمجھوتہ کرایا اور اِس طرح آنے والی ایک بڑی مصیبت کو ٹال دیا۔ ملک میں صدیوں سے چلی آرہی چھوت چھات کی لعنت کے خلاف اُنھوں نے تحریک چلائی اور لسانی تفریق کو دور کرنے کے لئے ہندی یا اُردو کے بجائے ''ہندوستانی زبان'' کا تصور پیش کیا، وہ اردو کو ایک ایسی زبان کی شکل دینا چاہتے تھے جس میں فارسی اور عربی کی جگہ مقامی اور علاقائی زبانوں کے آسان الفاظ استعمال ہوں، تاکہ ہندوستان کا ہر فرد و بشر اِس زبان کو سمجھ سکے اور یہ ''ہندوستانی زبان'' پورے ملک کو لسانی سطح پر جوڑنے کا ذریعہ بن جائے۔

گاندھی جی فرقہ وارانہ فسادات کے سخت خلاف تھے، بہار کے نواکھالی علاقے میں فساد ہونے پر، خود وہاں گئے اور طویل عرصہ تک قیام کرکے صورت حال کو نارمل بنانے کی کوشش کی، ہندوستان کی آزادی کے بعد پھوٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ دنگوں سے بھی سب سے زیادہ دُکھی وہی نظر آتے تھے، بعض ناسمجھ لوگوں نے اِسے اُن کی ہندو مخالفت سے تعبیر کیا، جو صحیح نہیں۔ حقیقت میں ظلم کسی کے خلاف ہو، گاندھی جی کا حساس دل اِسے برداشت نہیں کرسکتا تھا اور وہ اُس کے خلاف آواز اُٹھانے پر مجبور ہوجاتے تھے۔

گاندھی جی کے قومی اتحاد کے تعلق سے اِس نظریہ کا اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے تمام طبقات کو متحد کرنے کے لئے گاؤں اور شہر کو قریب لانے کی کوشش کی، اُنھوں نے دیہی زندگی کی اصلاح اور ترقی پر خاص طور سے زور دیا۔ صنعتی ترقی سے شہروں کی خوشحالی کو دیکھ کر وہ دیہاتوں کے پچھڑے پن کو دور کرنے میں مصروف ہوگئے۔ اُن کے قول کے مطابق حقیقی ہندوستان دیہاتوں میں بستا ہے اور اِس ہندوستان کو ترقی کے مواقع ملنا چاہئے۔

گاندھی جی کا قومی ایکتا کا نظریہ ذات پات اور علاقائی حدود سے اونچا تھا۔ اُنھوں نے افریقہ میں قیام کے دوران کالے اور گوروں کے درمیان تفریق کو مٹانے میں سرگرم کوشش کی اور وہاں کے سیاہ فام باشندوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز اُٹھائی۔ گاندھی جی کے تمام آدرش و اصول خواہ وہ اہنسا ہو، ستیہ گرہ ہو یا بھائی چارہ، نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں مقبول ہوئے اور عالمی پیمانے پر مفکروں، قلم کاروں اور فنکاروں نے اُنہیں سراہا۔ دوسری طرف یہ بھی ایک سچائی ہے کہ گاندھی جی کے قومی اتحاد کے نظریہ کو منافرت پھیلانے اور پھوٹ ڈالنے والوں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ جس کی قیمت گاندھی جی کو اپنی جان دے کر چکانی پڑی۔

گاندھی جی کی عظمت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد اُنھوں نے اقتدار میں کوئی حصہ نہیں لیا، اقتدار سے اِس دوری نے اُنہیں عظیم سے عظیم تر بنادیا۔ ❑❑

> **گاندھی جی ہر صبح گیتا کے ساتھ قرآن مجید اور انجیل مقدس کا مطالعہ کرتے تھے۔ ''مائی ایکسپریمنٹ وِتھ ٹُروتھ'' میں یہ اعتراف موجود ہے کہ جنوبی افریقہ کے قیام کے دوران کئی مسلمانوں سے اُن کے گھرے مراسم تھے، جو اسلامی تعلیمات سمجھنے میں اُن کیلئے مفید ثابت ہوئے۔ اُن سے جب معلوم کیا گیا کہ 'رام راجیہ' کے جس تصور کی وہ بات کرتے ہیں، وہ کس قسم کی حکومت کے طرز پر ہوگا تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ ''وہ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی حکومت کے طرز پر ہوگا۔''**

جمہوریت میں انصاف کے ساتھ مُساوات بھی ضروری

تحریر: جاوید اختر بھارتی

یہ حقیقت ہے کہ ہمارا ملک ہندوستان صدیوں سے امن واتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا گہوارہ رہا ہے، صوفی سنتوں کی آماجگاہ رہا ہے اور گنگا جمنی تہذیب کا سنگم رہا ہے جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے ساتھ ساتھ رہتے تو وہیں ایک دوسرے کے خوشی وغم میں برابر کے شریک ہوتے آئے ہیں مگر افسوس کہ نفرت اور ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے کی خطرناک وافسوسناک روش نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے چنانچہ اب پچھلے کچھ عرصہ سے ملک بھر میں کبھی مذہب کی بنیاد پر موب لنچگ ہوتی ہے تو کبھی نعروں کی تکرار ہوتی ہے جب نفرت میں اندھے ہوکر جھنڈ کی شکل میں کچھ لوگ کسی نہتے اور بے گناہ انسان کو پکڑ لیتے ہیں تو اسے مختلف طریقوں سے مجبور کرتے ہیں اور ایسا بھی مرحلہ آیا ہے کہ اسے پیٹ پیٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے، اس طرح کے واقعات ہندستان کے ماتھے پر کلنک اور بدنما داغ ہیں ایسا لگتا ہے کہ سرکاری مشینری نہ صرف اسے شہ دے رہی ہیں بلکہ مجرموں کو بچانے میں بھی کبھی کبھی مصروف نظر آتی ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر حکومت اور حکومت کی مشینری سب کی خوشحالی اور سب کے تحفظ کیلئے ٹھوس اقدامات کیوں نہیں کرتی تاکہ ہر ذات برادری، ہر مذہب کے لوگ بلا خوف رہیں تجارت کریں سفر کریں کسی طرح کی کوئی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے ایک انسان دوسرے کو انسان سمجھے، ایک برادر وطن دوسرے کو برادر وطن سمجھے ایک پڑوسی دوسرے کو پڑوسی سمجھے اور یہ تبھی ممکن ہے جب انصاف کا دامن تھاما جائے ورنہ انصاف سے منہ موڑنے کی بنیاد پر ملزموں اور مجرموں کے حوصلے بلند ہوں گے اور یہ آئین کے ساتھ مزاق ہوگا۔

یہ حقیقت ہے کہ مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بجائے اس کو بچانا قانون کی خلاف ورزی ہے، جمہوریت کی توہین ہے، ناانصافی ہے، ملک کی عوام کے ساتھ وشواس گھات ہے اور قول وفعل میں تضاد ہے حکومت اس رویئے پر قائم رہتی ہے تو اقلیتوں کا اعتماد کیسے حاصل کرسکتی ہے، پھر تو اقلیتوں کے اندر سے یہ آواز بھی اٹھ سکتی ہے کہ حکومت اقلیتوں کو جھوٹی تسلی دیرہی ہے اور ایسا ہوا تو اقلیتیں اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگیں گی جبکہ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ آئین کی بالادستی کو قائم رکھا ہے، ملک کی عدلیہ پر بھروسہ کیا ہے، جمہوریت کو فروغ دیا ہے، ملک کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے اور آج بھی مسلمانوں کو ملک کے آئین اور عدلیہ پر مکمّل اعتماد ہے، اب وزیر اعظم کو خود سوچنا چاہیے کہ سب کا ساتھ، سب کا وکاس، سب کا وشواس جیسا دیا گیا نعرہ کیسے کامیاب ہوگا کیونکہ کسی کے جذبات کو مجروح کرکے اس کا دل نہیں جیتا جاسکتا، کسی کے ساتھ ناانصافی کرکے اس کا اعتماد حاصل نہیں کیا جاسکتا، کسی کو تکلیف پہنچا کر کے اسے خوش نہیں رکھا جاسکتا یعنی مذکورہ نعرہ کی کامیابی کے لئے انصاف ضروری ہے تبھی ملک وملت کا بھلا ہوگا انصاف تو ہر حال میں ضروری ہے اور جہاں تک بات مذہب اسلام کی ہے تو مذہب اسلام کی تعلیمات یہ ہے کہ انصاف کے معاملے میں امیر وغریب اور مذہب کی تفریق نہیں رکھی گئی ہے بلکہ انصاف اور مساوات پر زور دیا گیا ہے یہاں تک کہ جہاں سات قسم کے لوگوں کو عرش الٰہی کے سائے میں رہنے کی بات کہی گئی ہے وہیں اس حدیث میں الامام العادل کا لفظ بھی آیا ہے کہ عدل وانصاف کرنے والا میدان محشر میں عرش الٰہی کے سائے میں ہوگا اور امام کے معنیٰ ذمہ دار کے ہوتے ہیں یعنی ہر وہ شخص جو کسی شعبے، کسی محکمے، کسی قوم، کسی ملک کا ذمہ دار ہے تو وہ امام کے زمرے میں آتا ہے مصلّی کا امام مقتدی کا ذمہ دار ہے، بادشاہ رعایا کا ذمہ دار ہے اسے ہر حال میں عدل وانصاف کا پرچم بلند کرنا ہوگا ظاہر سی بات ہے کہ جہاں عدل وانصاف سے کام لینے پر اللہ کی طرف سے انعام واکرام ہے تو ناانصافی کرنے پر اتنا ہی سخت ترین عذاب بھی ہوگا احادیث میں تو یہاں تک ملتا ہے کہ دنیا میں کوئی سینگ والی بکری کسی بغیر سینگھ والی بکری کو مارے گی تو اللہ تعالیٰ بروز قیامت بغیر سینگ والی بکری کو سینگ عطا کرے گا اور حکم دے گا کہ تو اپنا بدلہ لے لے یہ انصاف ہے، جب امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیت المقدس فتح کرنے کے لیے فلسطین کے لیئے چلے تو ایک اونٹ تھا اور ساتھ میں آپ کا غلام بھی تھا حضرت عمر نے کہا کہ تو لگام پکڑنا میں اونٹ پر بیٹھوں گا، میں لگام پکڑوں گا تو اونٹ پر بیٹھے گا اس طرح باری باری لگام پکڑتے ہوئے اور باری باری پیدل چلتے ہوئے سفر طے کیا جائے گا اتفاق یہ کہ جب یروشلم میں داخل ہونے کا موقع آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لگام پکڑنے کی باری آگئی غلام کو اونٹ پر بیٹھنے کی باری آگئی غلام بولا امیر المومنین اونٹ پر بیٹھنے کی میری باری بھلے ہی آگئی لیکن میں آپ کا غلام ہوں آپ اونٹ پر بیٹھیں آپ امیر المومنین ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نہیں مذہب اسلام کی یہ تعلیم نہیں ہے بلکہ مذہب اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جس کا جو حق ہے وہ دیا جائے میری لگام پکڑنے کی باری میں لگام پکڑونگا چنانچہ غلام کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر اونٹ پر بیٹھایا خود لگام پکڑے ہوئے یروشلم کے اندر داخل ہوئے یہ ہے انصاف، یہ ہے مساوات، خود نبی کریم صل اللہ علیہ وسلم کی ظاہری زندگی میں جب ایک عورت نے چوری کی تو رسول کائنات نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تو کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ عورت بڑے ہی سرمایہ دار گھرانے کی ہے لوگ کٹا ہوا ہاتھ دیکھیں گے تو انکی توہین ہوگی تو امام کائنات نے فرمایا کہ سنو پہلے کی قومیں اسی وجہ سے تباہ ہوئی ہیں کہ وہ لوگ مذہبی امور نافذ کرنے میں تفریق سے کام لیا کرتے تھے مذہب اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا اگر فاطمہ بنت محمد نے بھی چوری کی ہوتی تو میرا یہی فیصلہ اور یہی حکم ہوتا کہ فاطمہ کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، غرضیکہ انصاف اور مساوات کی ضرورت سب کو ہے اور سب کی ذمہ داری بھی ہے ظلم اور ناانصافی کی وجہ سے بڑی بڑی حکومتیں تباہ ہوگئیں نمرود، فرعون، شداد، ہامان یہ سب ظالم تھے ظلم و ناانصافی ان کا شیوہ تھا لیکن انجام یہ ہوا کہ آج پوری دنیا ان پر لعنت بھیج رہی ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان سے غلطیاں ہوتی ہیں لیکن قابل افسوس بات یہ ہے کہ کسی مذہبی اور دین پر عمل کرنے والے شخص سے کوئی غلطی ہوجائے تو اسے خوب اچھالا جاتا ہے یہاں تک کہ شریعت اور اسلام تک کو نشانے پر لے لیا جاتا ہے اور شریعت وسنت پر چلنے والے کو بدنام کیا جاتا ہے جس سے لوگوں کے دلوں میں ان کے متعلق نفرت پیدا ہوتی ہے نتیجتاً عوام الناس ان کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں اور اپنی دنیا و آخرت کی بربادی کا سامان اکٹھا کرتے ہیں، ایسے نامساعد حالات میں دین پر کاربند اور نماز وسنت کے پابند اسلامی بھائی بہنوں کو مزید محتاط ہونا چاہیے معمولی سی بے احتیاطی بھی کبھی کبھی زبردست نقصان کا باعث بنتی ہے۔ ❑❑

> **انصاف اور مساوات کی ضرورت سب کو ہے اور سب کی ذمہ داری بھی ہے ظلم اور ناانصافی کی وجہ سے بڑی بڑی حکومتیں تباہ ہوگئیں نمرود، فرعون، شداد، ہامان یہ سب ظالم تھے ظلم وناانصافی ان کا شیوہ تھا لیکن انجام یہ ہوا کہ آج پوری دنیا ان پر لعنت بھیج رہی ہے۔**

میزان

مولانا عبدالحمید نعمانی

جمہوریت میں قیادت ونمائندگی کے مسئلہ پر خصوصی توجہ کی ضرورت

قومی وملّی سیاست میں باعزت زندگی کے لیے راستہ طے کرنے اور مختلف امور میں انتخاب بڑا مسئلہ اور فیصلہ کن گھڑی ہوتی ہے۔ تاریخ زہر کا پیالہ اور امرت دونوں کا مجموعہ ہوتی ہے، غلطیوں سے سبق لیتے اور ان سے بچتے ہوئے بہتر حال اور اچھے مستقبل کے پیش نظر طریقۂ کار طے کرنا دانش مندی کا تقاضا اور وقت کی ضرورت ہے۔ یہ تو طے ہے کہ اب بھارت میں مسلم لیگ کے طرز پر صرف مسلمانوں اور ملت کے نام پر جداگانہ سیاست کے لیے کوئی جگہ نہیں رہ گئی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کے حوالے سے زیادہ باتوں کا کوئی معنی ومطلب بھی نہیں ہے، گزرتے دنوں کے ساتھ سیکولر کہی جانے والی پارٹیوں نے مسلمانوں (اور آدی واسیوں، دلتوں وغیرہ) کی ان دیکھی کر کے ملک کی اکثریت کی نظروں میں منظور ومحبوب بننے کی کوششیں شروع کردی ہیں، ان کے پیش نظر اور بھی ضروری ہوگیا ہے کہ قیادت ونمائندگی کے مسئلے پر خصوصی توجہ دی جائے، گزشتہ دنوں ۱۲ سے ۱۴رنومبر ۲۰۲۱ء تک بہار کی راجدھانی پٹنہ اور پھلواری شریف میں آل انڈیا ملّی کونسل کے سالانہ اجلاس میں ملک وملت کے جو مختلف مسائل وامور پر تفصیلی اظہارِ خیالات کے ساتھ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والوں کی طرف سے اہم تجاویز پیش ہوکر منظور ہوئیں ان سے کئی موجودہ مسائل پر غور وفکر کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ ۸راگست ۲۰۲۱ء کو دہلی میں جس طور سے ملک کی تمام معروف تنظیموں اور مؤثر شخصیات کی طرف سے ملّی اتحاد کی ضرورتوں اور وقت کے تقاضوں کے تناظر میں متفقہ موقف سامنے آیا تھا، اس کے دائرے کو وسیع کرتے ہوئے دیگر مشترکہ مقاصد ومسائل زیر جدوجہد لانے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ اس پر ملّی کونسل کے سالانہ اجلاس میں بھی توجہ وزور دیکھنے میں آیا۔ ہمیں وقتی کام کے بجائے کچھ امور پر تسلسل کے ساتھ کام کرنے اور جدوجہد کرنی ہوگی، ماہ دسمبر ۲۰۲۱ء میں ہی مشاورت کی ورکنگ کمیٹی کے دہلی اجلاس اور جمعیۃ علماء ہند کے کلکتہ اجلاس کی تجاویز اور فیصلوں کو سامنے رکھتے ہوئے آگے کے لیے متحدہ قدم اُٹھانا ملک وملت کے حق میں بہتر اور مفید ہی ہوگا۔

مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی بھی اگست ۲۰۲۱ء سے ملّی اتحاد پروگرام کا حصہ رہے ہیں۔ انھوں نے دیگر مواقع کے علاوہ ماہنامہ ’الفرقان‘ بابت ماہ دسمبر ۲۰۲۱ء کے اداریے میں جس آزاد اور اصولی سوچ والی سیاسی پارٹی کی تشکیل کی بات کہی ہے، اس کی بھی متحدہ کوشش وعمل ہی سے تشکیل ہوسکتی ہے۔ اتنا بڑا فیصلہ کچھ لوگوں کی انفرادی رائے و کوشش سے نتیجہ خیز اور ثمرآور نہیں ہوسکتا ہے۔ کچھ برسوں پہلے جمعیۃ علماء ہند نے مولانا اسعد مدنی کی سربراہی میں حالات کو دیکھتے ہوئے سیکولر اقدار و روایات اور مشترکہ مقاصد ومسائل کو لے کر ایک سیاسی پارٹی کی تشکیل کی ضرورت پر توجہ مبذول کرائی تھی لیکن کچھ وجوہ سے بات آگے نہیں جاسکی، جس کام میں انصاف اور مسئلے کا حل نظر نہ آئے، اس سے دوسروں کو جوڑنے اور سمجھانے کا عمل انتہائی مشکل ہوجاتا ہے۔ مبینہ سیکولر پارٹیوں کی طرف سے کام اور باتوں کی باتیں بہت ہوئیں

> یہ بات خلاف حقیقت ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کا موقف پوری مسلم قوم کو کانگریس میں ضم کردینے کا تھا، اس تناظر میں یہ دعویٰ مبنی پر دلیل نہیں رہ جاتا ہے کہ مولانا سجاد، جمعیۃ علماء کے موقف سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ اور اس کے مطبوعہ، غیر مطبوعہ ریکارڈ میں اس طرح کی باتوں کا کوئی ذکر وحوالہ نہیں ہے۔

لیکن ان میں انصاف، باعزت نمائندگی اور مسئلے کا حل نظر نہ آنے کے سبب کئی طرح کے مسائل پیدا بھی ہوئے اور مشکلات کا سامنا بھی جمہوری نظام حکومت اور انتخابی سسٹم میں کسی بھی قابل ذکر اور مؤثر کمیونٹی اور اکائی کو نظر انداز کر کے جمہوری اور انصاف کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آزادی اور تقسیم وطن کے ساتھ ہی آزاد بھارت کا منظرنامہ پوری طرح بدل جاچکا ہے۔ ایسی حالت میں کیا طریقۂ کار اقلیتوں اور محروم وپسماندہ طبقات کے لیے ہونا چاہیے، اس پر سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔ اس سلسلے میں تذبذب، مبہم اور ذومعنی باتیں کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ اس سے مخاطب کو راستہ اور رائے قائم کرنے میں کئی طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بسا اوقات وہ انتشار وتذبذب میں مبتلا ہوکر مایوسی کا شکار ہوجاتا ہے۔

حالیہ دنوں میں دو طرح کی تحریریں اور باتیں سامنے آرہی ہیں جن میں ملک کے نظام حکومت اور انتخابی طریقہ کار اور ان کے نتیجے میں پیدا شدہ حالات زیر بحث ہوتے ہیں۔ اس کی بڑی حد تک نمائندگی ماہنامہ ’زندگی نو‘ اور ’الفرقان‘ میں شائع امیر جماعت اسلامی ہند سیّد سعادت اللہ حسینی اور مولانا خلیل الرحمٰن سجاد کی تحریریں کرتی ہیں۔ حسینی کی تحریر میں نقطۂ نظر اور تنقید وتبصرہ کے ساتھ راستے، منزل اور ضروری نکات کی متعین و واضح نشاندہی کی گئی ہے، لیکن مولانا سجاد نعمانی کی تحریر میں راہِ عمل کا واضح تعین اور ملک کے جمہوری نظام اور تکثیری سماج میں ایسی متناسب نمائندگی کی رہنمائی نہیں ملتی ہے، جس کی موجودگی میں ایک آزاد جمہوری ملک میں کسی گروہ، چاہے وہ اکثریت میں ہی کیوں نہ ہو، کو دوسرے طبقات وگروہوں پر بالادستی قائم کرنے کا موقع نہ ملے، اس سمت میں ایک نقشہ کار بنا کر متحدہ قومیت کے تصور کے تحت مولانا انورشاہ کشمیریؒ، مولانا آزادؒ، مولانا مدنیؒ اور ان کے ہم خیال اکابر نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی لیکن بدقسمتی سے ملک کی تقسیم کے بعد بنایا نقشہ کار باقی نہیں رہ سکا، سابقہ نقشہ کار میں ابوالمحاسن، مولانا محمد سجاد بہاریؒ کے اس فارمولے کی پوری گنجائش تھی کہ کسی غیر مسلم پارٹی کے ٹکٹ پر مکمل سمجھوتا اور اطمینان کے بغیر مسلمان امیدوار الیکشن نہ لڑے، کیونکہ ایسی حالت میں امیدوار عموماً اپنے قومی و مذہبی مسائل کے لیے پارٹی مفادات کے سامنے مجبور رہے گا۔ مولانا سیّد محمد سجاد بہاری کا سیاسی و وطنی نظریہ اور مسلمانوں کے سلسلے میں دینی وسماجی موقف کے تعلق سے پوری نہیں تو بڑی حد تک ضرورت بھر باتیں ہمارے سامنے مختلف شکلوں میں آچکی ہیں۔ ان کے حوالے سے یہ کہنا حقیقت پرمبنی نہیں ہے کہ پوری مسلم قوم کا کانگریس میں ضم کردینے کے جمعیۃ علماء ہند کے موقف سے مولانا محمد سجاد شدید اختلاف رکھتے تھے، وہ جمعیۃ علماء ہند کے بنیادی ارکان ورہنماؤں میں سے ہونے کے ساتھ اس کی پالیسی سازی میں ان کا اہم کردار رہا ہے، اولاً تو یہی بات خلاف حقیقت ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کا موقف پوری مسلم قوم کو کانگریس میں ضم کردینے کا تھا، اس تناظر میں یہ دعویٰ مبنی پر دلیل نہیں رہ جاتا ہے کہ مولانا سجاد، جمعیۃ علماء ہند کے موقف سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ اور اس کے مطبوعہ، (باقی ص۱۴ پر)

گوشہ روزگار

انٹرنیٹ کے ذریعہ بڑھائیں اپنی آمدنی

آج کے جدید دور میں تعلیم اور ٹیکنالوجی لازم وملزوم ہوگئے ہیں۔ روایتی طریقۂ تعلیم میں بھی طالب علم زیادہ تر تعلیمی سرگرمیاں یا اسائنمنٹ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعہ مکمل کرتے ہیں۔ آج کے بچے اور نوجوان انتہائی تیز ذہن ہیں جو دنیا میں آنے والی تبدیلیوں سے باخبر رہتے ہیں۔ ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنی ذہانت کا استعمال کرتے ہوئے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کو نہ صرف نصابی اور سماجی سرگرمیوں بلکہ پیسے کمانے کے لیے بھی استعمال کریں۔ امریکہ، یورپ اور دیگر ترقی یافتہ ملکوں میں اکثر بچے اپنے تعلیمی اخراجات خود برداشت کرتے ہیں۔ وہ پیسے کمانے کے لیے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا استعمال کرتے ہیں۔ کوئی گیم ڈیولپر بنا ہوا ہے تو کوئی کمپیوٹر پروگرامر وغیرہ۔ آپ بھی اپنی صلاحیتوں کو جانچیں کہ آپ انٹرنیٹ پر کیا خدمات انجام دے سکتے ہیں؟ اگر آپ فائن آرٹ کے طالب علم ہیں تو آپ اپنا آرٹ آن لائن فروخت کر کے پیسے کما سکتے ہیں۔ آن لائن ٹیوشن پڑھا سکتے ہیں یا کسی کو آپ آن لائن ہوم ورک کر کے دے سکتے ہیں وغیرہ۔ اَپ ورک، فائیور اور فری لانسر جیسی دنیا کی مقبول ترین ویب سائٹس پر ہر شخص اپنے مطلب کا کام تلاش کر کے گھر بیٹھے اچھے خاصے پیسے کما سکتا ہے۔ ذیل میں ان شعبوں کی تفصیل پیش کی جارہی ہے جن کے ذریعے آپ ہر ماہ ایک معقول آمدنی حاصل کرسکتے ہیں۔

بلاگنگ: انٹرنیٹ پر دولت کمانے کا سب سے مقبول طریقہ بلاگنگ ہے۔ بلاگنگ کے ذریعے دولت کمانے کے لیے آپ کسی بھی موضوع پر بلاگ یا ورڈپریس جیسی بلاگنگ سروسز پر اپنا بلاگ بناتے ہیں اور پھر گوگل ایڈسینس یا اس سے ملتی جلتی سروسز کے ذریعے اپنے بلاگ پر اشتہار لگاتے ہیں۔ پھر آپ کے بلاگ پر جتنے زیادہ وزیٹرز آتے ہیں اور وہ ان اشتہارات پر کلک کرتے ہیں اتنے ہی زیادہ ڈالر آپ کے اکاؤنٹ میں جمع ہوتے چلے جاتے ہیں۔

فری لانسنگ: اگر آپ گرافک ڈیزائنر ہیں، ویب ڈیولپمنٹ جانتے ہیں، سرچ انجن آپٹیمائزیشن یا سوشل میڈیا مارکیٹنگ کا کام جانتے ہیں، ویڈیو ایڈیٹنگ میں مہارت رکھتے ہیں، غرض کمپیوٹر یا غیر کمپیوٹر کسی کام میں مہارت رکھتے ہیں تو آپ فری لانسنگ کے ذریعے بہترین کمائی کرسکتے ہیں۔ آپ اسکائپ کے ذریعے بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھا سکتے ہیں۔ اس وقت ملک میں بے شمار افراد فری لانسنگ کے ذریعے کما رہے ہیں۔

ایفیلی ایٹ مارکیٹنگ: ایفیلی ایٹ مارکیٹنگ سے دولت کمانے کا اصول بڑا سادہ ہے۔ اس طریقے میں آپ کسی شخص کی سروس یا پروڈکٹ کو مشہور کر کے اسے بیچتے ہیں جس کے بدلے میں آپ کو کمیشن ملتا ہے۔ آپ کے حوالے سے جتنی زیادہ مصنوعات فروخت ہوں گی آپ کو اتنے زیادہ پیسے ملیں گے۔ ایفیلی ایٹ مارکیٹنگ کے میدان میں بھی بے شمار کمپنیاں کام کررہی ہیں جس میں کلک بینک، ایمازون اور ای (باقی ص۱۴ پر)

دریچے

م-س-ج-

کورونا وائرس سے حفاظت میں فیس ماسک زیادہ مؤثر

برٹش میڈیکل جرنل میں شائع ایک تحقیق کے مطابق کورونا وائرس کی وبا کے دوران فیس ماسک کا استعمال دنیا بھر میں عام ہوگیا ہے۔ اب یہ دریافت کیا گیا ہے کہ جب لوگ فیس ماسک کا استعمال کرتے ہیں تو کووڈ سے متاثر ہونے کا خطرہ ۵۳ فیصد تک کم ہوجاتا ہے۔ یہ بات اس حوالے سے ہونے والی پہلی عالمی تحقیق میں سامنے آئی۔ ویکسین محفوظ اور زندگیاں بچانے کے لیے مؤثر ہیں مگر ان سے سو فیصد تحفظ نہیں ملتا، جبکہ بیشتر ممالک میں اب تک ہر شہری کی ویکسی نیشن نہیں ہوئی اور ابھی یہ بھی واضح نہیں کہ ویکسین کورونا وائرس کی ابھرتی اقسام کے پھیلاؤ کو روک سکیں گی یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نئے جامع تجزیے میں کووڈ سے بچاؤ کے لیے مؤثر سمجھی جانے والی احتیاطی تدابیر بشمول فیس ماسک کا استعمال، سوشل ڈسٹینسنگ اور ہاتھ دھونے سے بیماری سے تحفظ کی شرح کی جانچ پڑتال کی گئی۔ تحقیق میں دریافت کیا گیا کہ فیس ماسک کا استعمال سوشل ڈسٹینسنگ اور ہاتھ دھونا تمام کووڈ کیسوں کی شرح میں کمی کے لیے مؤثر اقدامات ہیں مگر فیس ماسک سب سے زیادہ مؤثر ہے۔ آسٹریلیا، چین اور برطانیہ کے طبّی ماہرین پر مشتمل ٹیم نے ہلاکت خیز وبا کے دوران اپنائی جانے والی احتیاطی تدابیر کے حوالے سے ہونے والی ۷۲ تحقیقی رپورٹوں کی جانچ پڑتال کی۔ بعد ازاں انھوں نے ایسی آٹھ تحقیقی رپورٹوں کو بھی دیکھا جن میں ہاتھ دھونے، فیس ماسک پہننے اور سوشل ڈسٹینسنگ پر توجہ مرکوز کی گئی تھی۔ فیس ماسک کے حوالے سے ہونے والی چھ تحقیقی رپورٹوں میں محققین نے کووڈ کیسوں کی شرح میں ۵۳ فیصد کو دریافت کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ فیس ماسک کا استعمال کورونا وائرس کے پھیلاؤ، کیسوں اور ہلاکتوں کی شرح میں کمی لاتا ہے۔ ۲۰۰ ممالک میں ہونے والی ایک تحقیق میں دریافت کیا گیا کہ جہاں فیس ماسک کا استعمال لازمی قرار دیا گیا وہاں کووڈ ۱۹ کے منفی اثرات میں لگ بھگ ۴۶ فیصد کمی آئی۔ امریکہ میں ہونے والی ایک اور تحقیق میں دریافت کیا گیا کہ کورونا وائرس کا پھیلاؤ ان ریاستوں میں ۲۹ فیصد گھٹ گیا جہاں فیس ماسک کا استعمال لازمی قرار دیا گیا تھا مگر تحقیقی ٹیم نے فیس ماسک کی اقسام کے اثرات، فیس ماسک پہننے کے دورانیہ یا فیس ماسک پہننے کی پابندی پر عمل جیسے عوامل کا تجزیہ نہیں کیا۔ سماجی دوری کے حوالے سے ۵ تحقیقی رپوٹروں کی جانچ پڑتال سے محققین نے دریافت کیا کہ اس احتیاطی قدم سے کووڈ ۱۹ کی شرح میں ۲۵ فیصد تک کمی آسکتی ہے۔ اسی طرح ہاتھ دھونے سے بھی کووڈ کیسوں میں ۵۳ فیصد کمی کو دریافت کیا گیا مگر نتائج کو اس لیے اہم قرار نہیں دیا گیا کیونکہ اس حوالے سے تحقیقی رپورٹوں کی تعداد کم تھی۔ محققین کا کہنا تھا کہ نتائج اب تک ہونے والے تحقیقی کام سے مطابقت رکھتے ہیں یعنی فیس ماسک کا استعمال اور سوشل ڈسٹینسنگ وائرس کے پھیلاؤ کی شرح کم کرتا ہے مگر انھوں نے کہا کہ اس حوالے سے مزید تحقیق کی ضرورت ہے خاص طور پر اس وقت جب ویکسین دستیاب ہیں اور کورونا کی زیادہ متعدی اقسام بھی عام ہورہی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جب ویکسی نیشن کی شرح زیادہ ہوجائے گی تو ان احتیاطی تدابیر کی افادیت کی جانچ پڑتال کے لیے مزید تحقیق کی ضرورت ہوگی۔ مگر انھوں نے مزید کہا کہ ایسا ممکن ہے کہ کووڈ ۱۹ کی وبا کو مزید کنٹرول کرنے کا انحصار نہ صرف ویکسی نیشن اور ان کی افادیت پر ہوگا بلکہ موجودہ احتیاطی تدابیر پر عمل جاری رکھنا ہوگا۔

بڑھاپے کے مسائل پر توجہ دیجیے

وہ لوگ جنھوں نے بھرپور زندگی گزاری ہے، جن کے اردگرد رشتے دار اور دوست احباب وغیرہ ہوا کرتے تھے جو قہقہوں اور خوشیوں کے درمیان رہتے تھے، وہ بڑھاپے میں عموماً کرب کا شکار ہوجاتے تھے کیونکہ انھیں بری طرح نظر انداز کیا جاتا ہے اور ان کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہمارے یہاں ایسے تربیت یافتہ افراد کی بہت کمی ہے جو خاص طور پر بوڑھوں کی دیکھ بھال اور ان کے علاج کا تجربہ رکھتے ہوں۔ مثال کے طور پر اگر کسی کم عمر شخص کی ہڈی میں فریکچر ہوجاتا ہے تو اس کے علاج ومعالجہ کے لیے آرتھوپیڈک مناسب ہے لیکن اگر یہ فریکچر کسی ضعیف کو ہو تو آرتھوپیڈکس کے ساتھ ساتھ اسے نیرولوجسٹ کے پاس بھی لے جانا چاہیے کیونکہ اس بوڑھے کی جسمانی ساخت نوجوان سے بالکل مختلف نیز کافی کمزور ہوتی ہے۔ ہندستانی بوڑھوں کی ایک بہت بڑی تعداد غیر ملکوں میں مقیم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو یا تو بہت عرصہ قبل خود وہاں گئے تھے اور اب بوڑھے ہوگئے ہیں یا پھر ان کی اولادوں نے انھیں وہاں اپنے پاس بلالیا ہے اور اب وہ بڑھاپے کا کرب برداشت کررہے ہیں۔ ایسے بوڑھوں کی تنہائی کی داستان دیگر کے مقابلے میں کہیں زیادہ پریشان کن ہوتی ہے۔ وہاں تنہائی کا احساس اور بھی زیادہ ہے کیونکہ ان کے اپنوں کو ان کی طرف دھیان دینے کی فرصت نہیں ہوتی۔ ایسے بوڑھوں کے لیے وہاں دو قسم کی دشواریاں ہوتی ہیں۔ ایک دُکھ تو ان کی اپنی شدید تنہائی کا ہوتا ہے اور دوسرا دُکھ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ناکامی کو محسوس کر کے تڑپ کر رہ جاتے ہیں۔ ناکامی اس بات کی کہ وہ اپنی اولادوں کو مغرب زدہ ہونے سے بچانے کے لیے کچھ نہیں کرسکے۔ وہ اپنی مشرقی روایات کو اپنی اولادوں تک منتقل کرنے میں ناکام رہے ہیں، اور ناکامی کا یہ احساس انھیں ہر دم اداس اور پریشان رکھتا ہے۔ وہ جب کبھی اپنی اولاد کو ان کے اپنے ملک میں واپس لے جانے کی بات کرتے ہیں تو اولاد صاف طور پر انکار کردیتی ہے اور وہ بے بس ہوکر رہ جاتے ہیں۔ انھیں ہر دم خوف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ خوف غیر محفوظ مستقبل کا ہے۔ آرتھوپیڈک خوف تنہائی کا ہے، خوف اپنے کلچر اور اپنی روایات سے الگ ہوجانے کا ہے۔ اس بات کا خوف کہ وہ بچوں کے رحم وکرم پر رہ گئے ہیں۔ اس کا خوف کہ خدا جانے آنے والا وقت ان کے لیے کیسے مسائل لے کر آتا ہے۔ غرض یہ کہ اگر زندگی کی بنیادی سہولیات میسر نہ ہوں تو پھر بڑھاپا واقعی عذاب ہے۔

برطانیہ میں بڑھ رہا ہے امیری غریبی کا فرق

برطانیہ کی معیشت ۲۰۰۷ء کے بعد تا حال کساد بازاری میں گھری ہوئی ہے۔ وہاں بے روزگاری میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے۔ عام آدمی کی قوتِ خرید کم ہوتی جارہی ہے۔ پچھلی مخلوط حکومتیں عوام کو طفل تسلیاں دینے کے لیے نت نئے افسانے تراشتی رہی ہیں لیکن ان کی کوئی تدبیر حالات سنوارنے میں ممد ومعاون ثابت نہیں ہوسکی ہے۔

اب موجودہ حکومت کا خیال ہے کہ برطانیہ میں مینوفیکچرنگ انڈسٹری میں بہتری آجائے گی جس سے بڑھتی ہوئی بے روزگاری رک جائے گی لیکن بدقسمتی سے بہتری کی طرف جانے کے بجائے مینوفیکچرنگ انڈسٹری کی کارکردگی پچھلے کوارٹر میں نیچے گر گئی کیونکہ اس بری حالت میں مزید پھنسی معیشت میں بہت سے سرمایہ کار تیزی سے اپنا سرمایہ ملک سے باہر ٹیکس سے محفوظ زون میں لے جارہے ہیں یا پھر سرمایہ کاری کے بجائے اپنے قرضے واپس لوٹا رہے ہیں۔ یہاں افراطِ زر ابھی چار فیصد سے اوپر جارہی ہے۔ گو کہ چھوٹے ٹریڈرز اور دوکاندار قیمتوں میں کمی کر کے اپنے سرمایہ کا سرکولیشن برقرار رکھنا چاہتے ہیں (باقی ص۱۴ پر)

جمہوری ہندستان میں افسپا قانون ضرورت ہے یا ظلم و جبر کی علامت

تحریر: ایڈوکیٹ ابوبکر سباق سبحانی

دسمبر کی ۴؍تاریخ کو ناگالینڈ کے مون ضلع میں فوج نے ایک آپریشن کے دوران چودہ افراد کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا، ناگالینڈ میں آزادی کے وقت سے ہی علیحدگی پسند تحریکیں پورے زورشور سے متحرک رہی ہیں، تاہم مارے گئے تیرہ افراد کا تعلق کونیک قبیلے سے تھا جو کہ عموماً حکومت کا حامی تسلیم کیا جاتا ہے، اس حادثے کے بعد سلامتی افواج کو مخصوص اختیارات دینے والے قانون آرمڈ فورسیز اسپیشل پاورس ایکٹ (AFSPA) کو لے کر بحث شروع ہوگئی ہے، یہ قانون ہماری افواج کو لامحدود اختیارات فراہم کرتا ہے حتیٰ کہ کوئی بھی فوجی کسی بھی شہری پر صرف شک کی بنیاد پر گولی چلا سکتا ہے اور اس قتل کے جرم میں اس فوجی کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی جاسکے گی۔ اس حادثے کے بعد ایک بار پھر افسپا قانون کو ختم کرنے کی آواز اُٹھنی شروع ہوگئی ہے۔ ۷؍دسمبر کو ناگالینڈ کیبنٹ نے افسپا قانون کو ختم کرنے کی سفارش منظور کی ہے، افسپا قانون کے خلاف ناگالینڈ و نارتھ ایسٹ کے دیگر صوبوں میں ایک لمبے عرصے سے آوازیں اُٹھتی رہی ہیں۔ افسپا قانون کے خاتمے کی مانگ کو لے کر ہی ۵/نومبر ۲۰۰۰ء میں سماجی کارکن اروم شرمیلا بھوک ہڑتال پر بیٹھی تھیں اور سولہ سال مکمل کرنے کے بعد ۹/اگست ۲۰۱۶ء کو اپنی بھوک ہڑتال ختم کی۔

۸/اگست ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بمبئی سیشن کے دوران مہاتما گاندھی نے 'بھارت چھوڑو تحریک' کی بنیاد رکھی تھی، بھارت چھوڑو تحریک نے انگریز حکومت کے لیے اس ملک میں اپنے اقتدار کو محفوظ رکھنا مشکل ہوگیا تھا۔ انگریز حکومت نے اس تحریک کو اپنی فوجی طاقت کے زور پر ختم کرنے کے لیے ۱۵/اگست ۱۹۴۲ء کو چار آرڈیننس پاس کیے، جو کہ بنگال ڈسٹرب ایریاز (اسپیشل پاورس آف آرمڈ فورسیز) آرڈیننس، آسام ڈسٹرب ایریاز (اسپیشل پاورس آف آرمڈ فورسیز) آرڈیننس، اور یونائیٹڈ پرونسیز ڈسٹرب ایریاز (اسپیشل پاورس آف آرمڈ فورسیز) آرڈیننس شامل تھے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد ہماری حکومت نے تقسیم ہند کے بعد ملک کے مختلف علاقوں میں ہونے والی داخلی دراندازیوں کو روکنے کی غرض سے ان آرڈیننس کو دوبارہ نافذ کیا، لیکن افسپا کو باقاعدہ قانون کی شکل ۱۹۵۸ء میں ملی جب وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نے پارلیمنٹ کے ذریعے یہ قانون پاس کیا۔

افسپا قانون کو شمال مشرقی صوبوں کے علاوہ جموں و کشمیر اور پنجاب میں نافذ کیا گیا۔ سب سے پہلے پنجاب سے اس قانون کا نفاذ ہٹایا گیا جس کے بعد تریپورہ اور میگھالیہ سے بھی اس کا خاتمہ ہوا تاہم جموں و کشمیر، آسام، ناگالینڈ، میزورم، منی پور اور اروناچل پردیش میں ابھی تک یہ قانون نافذ ہے جہاں سلامتی افواج کو غیر معمولی اختیارات و مراعات حاصل ہیں۔ یہ قانون صوبے کے گورنر یا مرکز کے ماتحت صوبوں کے منتظم کو ہی یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ کسی صوبے یا صوبے کے کسی بھی حصے کی ڈسٹرب علاقہ کے طور پر نشاندہی کریں۔ دستورِ ہند کے آرٹیکل ۳۵۵ کے تحت مرکزی حکومت کی دستوری ذمہ داری ہے کہ وہ ملک کے ہر صوبے و علاقے میں داخلی امن وامان قائم رکھے اور ہر طرح کے خلل سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے، اسی آرٹیکل کے تحت مرکزی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی بھی علاقے کو ڈسٹرب علاقہ تسلیم کرکے وہاں مرکزی قانون افسپا کے تحت مرکزی افواج کو غیر معمولی اختیارات کے ساتھ تعینات کردے، ان غیر معمولی اختیارات میں فوج کسی کو بھی بغیر کوئی وجہ بتائے یا وارنٹ لیے یا دکھائے بغیر گرفتار کرسکتی ہے۔ کسی کے گھر یا کسی بھی جگہ کوئی سرچ وارنٹ لیے بغیر داخل ہوکر سرچ کرسکتی ہے اور اس سرچ یا تلاشی کے لیے فوج کو کسی بھی مروّجہ قانون کا پاس و لحاظ رکھنا ضروری نہیں ہوگا نیز صرف شک کی بنیاد پر ہی کسی کے اوپر گولی چلائی جاسکتی ہے نیز کسی کی جان جانے پر بھی اس فوجی کے خلاف قتل کا مقدمہ درج نہیں ہوگا اور نہ ہی مروّجہ قوانین کے تحت پولیس گرفتار کرسکتی ہے اور نہ ہی مروّجہ عدالتی نظام کے تحت یا فوجداری قوانین کی روشنی میں اس کو عدالت میں پیش کرکے مقدمہ چلایا جائے گا۔

۱۹۵۸ء کے قانون آرمڈ فورسیز اسپیشل پاورس ایکٹ (افسپا) کے خاتمے کے لیے ۱۹۹۷ء میں ناگا پیپلز موومنٹ آف ہیومن رائٹس نے یونین آف انڈیا کو پارٹی بناتے ہوئے پٹیشن داخل کی تھی، اس پٹیشن میں افسپا کی دستوری حیثیت کو چیلنج کیا گیا تھا۔ نیشنل ہیومن رائٹس کمیشن (این ایچ آر سی) بھی اس مقدمے میں پارٹی یعنی رفیق مقدمہ تھا، بحث میں کہا گیا کہ صوبے میں لا اینڈ آرڈر کو قائم کرنا یا بحال رکھنا صوبہ کی دستوری ذمہ داری ہے، پارلیمنٹ صوبے کے لا اینڈ آرڈر کے ضمن میں کوئی قانون نہیں پاس کرسکتا ہے، دستور کے آرٹیکل ۳۵۲ میں ایمرجنسی کے نفاذ سے متعلق شقات درج کی گئی ہیں جس میں صوبے کی پولیس و انتظامیہ کے اختیارات مرکزی حکومت کے پاس چلے جاتے ہیں جبکہ افسپا قانون کے نفاذ کے بعد صوبے کی پولیس و انتظامیہ کے اختیارات منتقل ہی نہیں ہوتے، پورے نظام کے اختیارات ہی سلب ہوجاتے ہیں حتیٰ کہ عدلیہ کے اختیارات بھی محدود ہوجاتے ہیں۔

سپریم کورٹ کی جانچ ججوں پر مشتمل بنچ نے متفقہ طور پر اس قانون کو قائم و دائم رکھتے ہوئے پٹیشن کو خارج کردیا تاہم سپریم کورٹ نے یہ تشریح ضرور کردی کہ اس قانون کا اطلاق وقتی طور پر ہی کیا جائے گا نیز حالات کے استوار ہوتے ہی اس قانون کو واپس لے لیا جائے گا، اس کے ساتھ ہی ساتھ کسی بھی صوبے یا علاقے کو ڈسٹرب علاقہ تسلیم کرنے سے پہلے صوبائی حکومت کی رائے لینی ضروری ہوگی نیز وقتاً فوقتاً صورتِ حال کا جائزہ لینا ضروری ہوگا۔ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں یہ حکم تو دیا کہ فوج اس قانون کے تحت حاصل اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے کم سے کم طاقت کا ہی استعمال کرے گی تاہم حالیہ حادثہ نے سپریم کورٹ کے فیصلے کو تار تار کردیا۔ افسپا کی دفعہ ۶ کے تحت متاثر شخص کے ذریعے اس کے ساتھ ہوئے حادثہ میں اختیارات کے غلط یا ناجائز استعمال کی شکایت ایک شکایت نامہ دے کر کی جائے گی، انکوائری کے بعد اگر الزامات صحیح ثابت ہوئے تو متاثرہ شخص کو معقول معاوضہ دیا جائے گا جبکہ متعلقہ فوجی یا فوجی افسر کے خلاف قانونی کارروائی کے لیے سینکشن آرڈر فراہم کیا جائے گا۔

۲۰۰۴ء میں کانگریس حکومت نے سپریم کورٹ کے ریٹائرجج جسٹس جیون ریڈی کے ماتحت پانچ ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جس سے ہم جسٹس جیون ریڈی کمیشن کے نام سے واقف ہیں، اس کمیٹی نے ۲۰۰۵ء میں اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ افسپا قانون ظلم وزیادتی کا ایک نشان بن گیا ہے نیز اس قانون کو ختم کرنے کی سفارش کی۔ اس کے بعد ایک دوسرا کمیشن ویرپا موئلی کی قیادت میں بنایا گیا لیکن کسی بھی حکومت نے ایمانداری کے ساتھ اس قانون کو ختم کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی اور نہ ہی اس کے غلط استعمال کو روکنے کی غرض سے افسپا قانون میں کوئی ترمیم و تنسیخ کی۔

اس قانون کے تحت حقوقِ انسانی کی خلاف ورزی کا حالیہ حادثہ اپنی نوعیت کا کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے، ۲۰۱۲ء میں منی پور کی ایک سماجی تنظیم 'اکسٹرا جوڈیشیل اکزیکیوشن وِکٹم فیملیز ایسوسی ایشن آف منی پور' نے سپریم کورٹ میں پٹیشن داخل کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ ۱۹۷۹ء سے ۲۰۱۲ء کے دوران سلامتی افواج کے ذریعے اس کالے قانون افسپا کا غلط استعمال کرتے ہوئے کل ۱۵۲۸ فرضی انکاؤنٹر کیے گئے ہیں۔ سپریم کورٹ نے تین رکنی کمیٹی کے ذریعے ۲۰۰۹ء کے ۶ فرضی انکاؤنٹر کے معاملات میں انکوائری کا حکم دیا تھا اور اس کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق وہ تمام ۶ معاملات میں فوج نے فرضی انکاؤنٹر کیا تھا۔ اگر ہماری مرکزی حکومت واقعی امن وامان کی بحالی کو لے کر سنجیدہ ہے تو کالے قوانین کے ذریعے عوام پر ظلم وستم یا فوج کا خوف طاری کرنے کے بجائے عوام میں دستور، عدلیہ و حکومت کے تئیں ایمان و اطمینان قائم کرنے کی کوشش کرے۔ □□

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں یہ حکم تو دیا کہ فوج اس قانون کے تحت حاصل اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے کم سے کم طاقت کا ھی استعمال کرے گی تاہم حالیہ حادثہ نے سپریم کورٹ کے فیصلے کو تار تار کردیا۔ افسپا کی دفعہ ٦ کے تحت متاثر شخص کے ذریعے اس کے ساتھ ہوئے حادثہ میں اختیارات کے غلط یا ناجائز استعمال کی شکایت ایک شکایت نامہ دے کر کی جائے گی، انکوائری کے بعد اگر الزامات صحیح ثابت ہوئے تو متاثرہ شخص کو معقول معاوضہ دیا جائے گا جبکہ متعلقہ فوجی یا فوجی افسر کے خلاف قانونی کارروائی کے لیے سینکشن آرڈر فراہم کیا جائے گا۔

انڈین چائلڈ میرج بل ۲۰۲۱ء — ایک سرسری جائزہ

قانونِ ہند کی دفعات کا سرسری جائزہ لیا جائے تو چند دفعات غیر معتدلانہ نظر آتی ہیں، ان میں سے ایک پر نظر ڈالیے میرج ایکٹ عجیب تماشہ ہوا ہے اس کے ساتھ، ہوا یہ کہ انگریزی غاصبانہ دورِ اقتدار کے ۱۸۶۰ء میں سب سے پہلے انڈین پینل کورٹ نے یہ قانون اسمبلی حلقے سے پاس کیا کہ دس برس سے کم عمر لڑکی کے ساتھ جائز رشتہ قائم کرنا (نکاح کرنا) قانوناً جرم مانا جائے گا۔ Sexual intercourse with a girl below the age of 10.

اس سے پہلے ایسا کوئی قانون نہیں تھا، اس کا مطلب تھا کہ دس سال سے زائد عمر کی لڑکی قانونی اعتبار سے شادی کے لائق سمجھی جائے گی، لیکن پھر ۱۹۲۷ء میں اس قانون میں ہلکی ترمیم کرکے بارہ سال مقرر کیا گیا، گویا بارہ سال سے کم عمر لڑکی رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے لائق قانونی اعتبار سے نہیں سمجھی جائے گی۔

Age of consent bill, 1927 made marriages with a girl under 12 invalid.

یہ قانون بھی سودمند ثابت نہ ہوا، اب پھر دو سال مزید اضافہ کرکے ۱۹۲۹ء میں شاردہ ایکٹ سے مشہور میرج قانون نافذ کیا گیا، کہ لڑکی کے چودہ سال اور لڑکے کے اٹھارہ سال سے قبل عقد نکاح میں بندھنا قانوناً جرم ہوگا۔

Sharda act of 1929 child marriage restraint act set 14 and 18 years minimum age of marriage.

اس طرح کی بار بار تبدیلیوں سے چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ حکومت ہمارے معاشرتی معاملات میں دخل نہ دے، ان اٹھنے والی طاقتور آوازوں کا اثر یہ ہوا کہ حکومت نے یہ مسئلہ علیٰ حالہ چھوڑ دیا، جو آزادی تک یوں ہی لڑکھڑاتے پہنچا۔

آزادی کے بعد جب نیا قانون بنا، قانون ساز اسمبلی نے معاشرے کی تنظیم اور تضبیط کے لئے انتظامی امور سے متعلق نئے اور سیکولر قوانین کی وضع کے نام پر پھر سے میرج ایکٹ کی دفعات میں عاقدین کی عمر بڑھادی، لڑکی کی شادی کے لئے اٹھارہ اور لڑکے کے واسطے ۲۱ برس مقرر کی گئی، اس عمر سے پہلے شادی قانوناً جرم مانی جائے گی اور یہ قانون آج تک نافذ ہے۔

1978 sharda act amended since then, the minimum legal age for marriage has been 18 for women and 21 for man.

۲۰۰۶ء میں اس کو مضبوط کرنے کے لئے حکومت کی جانب سے یہ سختی عائد کی گئی کہ اگر کوئی غیر مسلم لڑکی ۱۸ سال اور لڑکا ۲۱ سال سے پہلے شادی کرتا ہے تو اس کے ماں باپ کے ساتھ پنڈت کو بھی سزا ہوگی۔

2006 prohibition of child marriage act, 2006 also prescribe 18 and 21 years as the minimum age of consent for mariiage for women and man respectively, Strict punishments.

یہ تو قانونی گفتگو ہوئی، اب ذرا اس پہلو کو دیکھئے کہ جب یہ ملک جمہوری ہے تو اسمبلی کو اس معاشرتی معاملے میں قانون وضع کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، اس لئے کہ ہر مذہب میں شادی کے معاملے کا مزاج مختلف ہے، لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں ہندوستان میں ایسے گھر ہیں جہاں اس قانون کو پامال کیا گیا، اور اب بھی اپنے اسی ہندوستان کے بہت سے خطوں کا رواج ہے کہ نوجوانی میں ہی شادی ہوجایا کرتی ہے۔

دوسری بات: ہندوستانی میرج ایکٹ اپنی کئی بار کی ترمیم سے غیر معمولی وقعت کھو بیٹھی ہے، اب باوجود یہ کہ کئی سالوں سے اس میں ترمیم کی نوبت بظاہر نہیں آئی لیکن اگر اس معاملہ پر غور کیا جائے، تو اس میں ترمیم کی ضرورت پہلے سے کئی گنا زیادہ ہوگئی ہے، مخلوط تعلیم کا سب سے بُرا اثر یہ ہوا کہ شادی سے قبل ہی کالج اور اسکولوں کے بچے، بچیاں اپنے جذبات کے نت نئے پینترے اور خواہشات کی آگ کو کئی بار ٹھنڈا کر چکے ہوتے ہیں، مشاہدات بھی موئید ہیں اور ان کی یہ حرکت مجبوری درجے کی چیز ہوتی ہے، کیونکہ ایک طرف والدین اس کو جلد شادی کرانے پر راضی نہیں ہیں، اور دوسری طرف اگر وہ کورٹ کا سہارا لیں تو وہ بھی اپنی قانونی عمر سے قبل کسی کی اس حرکت کو اس کا جرم سمجھتی ہے، اب بغیر شادی کے ایسا رشتہ قائم کرنا ان کے لئے مجبوری ہوجاتی ہے۔ کسی کی خواہشات بھڑکنے کی کوئی عمر تھوڑی ہوتی ہے کہ وہ ۱۸ یا ۲۱ سال کے بعد ہی بھڑکے گی، ہاں اتنا معلوم ہے کہ بلوغیت کے بعد ہی ایسا ہوگا، اگر قانون بنانا ہی تھا تو بلوغیت کی عمر مقرر کردی جاتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اور ہمارے پیارے پیغمبر نے ساڑھے چودہ سو سال پہلے بتا دیا کہ نکاح کی عمر بلوغیت ہے۔ اب بچہ جس عمر میں بھی بالغ ہو اور بالآخر اس چیز کو عدالت بھی تسلیم کرتی ہو، اور یہ بیان دیتا ہو کہ مسلمانوں میں لڑکی بالغ ہوتے ہی نکاح کرسکتی ہے۔

In islam, the marriage of a miner who has attained puberty is considered valid under parasnal law.

کیونکہ ہر طبقے میں شادی کا رواج اور چلن بلوغیت کے بعد ہی ہے، اس سے قانون بھی محفوظ رہتا ہے اور نوجوانوں کی بے داغ جوانی بھی پاک رہتی ہے۔ ہمیں سمجھ نہیں آتا سرکار کرنا کیا چاہتی ہے، ایک طرف تو شادی کی عمر میں اضافہ کردیتی ہے اور دوسری طرف ہم جنس پرستی کو روا ٹھہراتی ہے، حد تو یہ ہوگئی کہ اگر آپسی رضامندی سے لڑکا لڑکی ناجائز تعلق بھی قائم کرلیں تو یہ سرکاری نگاہ میں کوئی جرم نہیں ہے، لڑکی اگر اپنے اوپر ہوئی زیادتی کے واسطے انصاف کی مانگ کرے گی تو کورٹ کچہری بھی ایسی صورت میں خاموش برت لے گی کہ جب لڑکا بوقت تعلق بدکاری سے اس لڑکی کی رضامندی پر دلیل پیش کردے گا تو گویا سرکار ہی بُرائی اور بے حیائی اور فحاشی کا راستہ ہموار کررہی ہے۔

تف ہے! سرکار کے اس ماڈل سوچ پر جو یورپی ذہنوں کی چاپلوسی میں اتری ہوئی ہے، اور وہاں کے ننگ وعار ماحول کو رازِ ترقی گردانتی ہے، وہاں تو لوگوں نے اولاً خوب ترقی کی اور وہ بھی ہمارے ہی آٹھ سو سالہ دورِ حکمرانی میں، پھر کفر کی حکومت آئی تو سرے عام جسم فروشی کا اڈہ قائم ہوا، اور یہاں بُرائی کے ذریعہ سے (باقی صـ۱۴ پر)

ماضی کے جھروکے سے

تاریخ اسلام کا ایک ورق

ہندستان میں اسلام اور مسلمانوں کی آمد ۳

تحریر: فاروق اعظم عاجز

یوں تو ہلکی پھلکی جھڑپیں ۱۵ھ ہی سے شروع ہو چلی تھیں، نیز سندھی قیدیوں کا - جن کو ایران لڑائی کے وقت کام میں لاتا تھا - عربوں کے ساتھ ہم محاذ ہونے کا اشارہ بھی تاریخ سے ملتا ہے؛ لیکن باضابطہ ہند پر حملہ کا نقشہ یوں ہے: راجا داہر کی سرکشی مسلمانوں کے خلاف حد سے متجاوز ہونے کی وجہ سے سب سے پہلے عراق کے گورنر حجاج نے محمد بن قاسم کو ہندوستان کی طرف بارہ ہزار افواج مع اسباب و آلاتِ حرب وضرب کے رجا داہر کی گوشمالی کے لیے روانہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اسلامی لشکر جرار کی رجا داہر کی فوج سے زبردست معرکہ ہوا اور راجا داہر مارا گیا۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کی سرزمین کو ظلم وسرکشی سے پاک کردیا، پھر محمد بن قاسم نے پے درپے کئی مقامات فتح کر لیے اور ان پر شاندار کارکردگی دکھائی جس کی تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ اہل سندھ پہلے کیا تھے اور اسلام کے مقدس اور روح افزا سایے میں آنے کے بعد اخلاق اور تعلیم وتہذیب کے کیسے اعلیٰ معیار پہنچ گئے۔ محمد بن قاسم کے بعد متعدد مسلم حکمراں آئے اور تھوڑی تھوڑی مدت میں بدلتے رہے جس کی وجہ سے پہلے کے بنسبت نظم و نسق خاصا اثر انداز ہوا۔ البتہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے دور اقتدار میں اہل سندھ و ہند کے نام دعوتی خطوط روانہ کیے۔ جن میں توحید و رسالت کی دعوت اور بت پرستی و بداخلاقی سے باز رہنے کی بات تھی۔ جس کا سردست نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ بہت سارے ہندو سرداران اسلام میں داخل ہوگئے جن میں سرفہرست ''جے سنگھ'' بن داہر تھا۔

ان تاریخی حقائق (جو مغربی مورخین کی نفرت آمیز آلودگی میں اوجھل ہوکر رہ گئے) پر اہل وطن کو غور کرنے کا مقام ہے۔ پھر مسلمان حکمرانوں کا یہ سلسلہ عبدالملک بن شہاب ۷۷۶ تک چلا اس کے تقریباً دو صدی بعد ۹۹۷ میں محمود غزنوی کا ورود ہوا اور متعدد حملوں کے بعد حکومت ہند کی باگ ڈور سنبھالی، پھر تقریباً ڈیڑھ صدی کے بعد ۱۱۷۱ء میں محمد غوری آیا اور کئی معرکہ آرائیوں کے بعد فتح حاصل کی اور سلاطین ہند میں شامل ہوا لیکن ہندوستان پر باضابطہ مسلمانوں کی طویل حکومت کا آغاز سلطان ظہیرالدین بابر سے ہوا اس لیے کہ بابر سے پہلے جو بھی آیا اس کی حکومت محدود علاقے تک رہی چہ جائیکہ محمود غزنوی نے اس میں کافی وسعت پیدا کی، دوسرے یہ کہ ایک کے بعد دوسرے کے آنے تک عرصہ ؟ دراز کا خلا بھی رہا۔

چنانچہ انھی دونوں رکاوٹوں کے باعث اسلامی اثر ورسوخ اہل ہند میں کامل طور پر اثر انداز ہوسکا اور یہاں کے لوگوں میں تعلیم اور تہذیب وتمدن کا بڑا فقدان تھا، اور جو تھوڑی سی مقدار صوفی سنتوں کی تھی بھی تو وہ اس قدر رہبانیت کے گہرے سمندر میں غوطہ زن تھے کہ اپنی ہی ذات سے ناآشنا تھے، تو بھلا ان کے ذریعہ دوسرے کی اصلاح کی کیا توقع۔

بابر نے ہندوستان کو کس حالت میں پایا

بابر نے ترکستان سے مختلف مقامات مسخر کرتا ہوا ۱۵۲۶ء میں ہندوستان کو بھی اپنے زیر کمان کرلیا لیکن ہندوستان کی معاشرت اسے بڑی عجیب وغریب محسوس ہوئی، اور اہل ہند اسے تہذیب و تمدن سے کوسوں دور نظر آئے۔ چنانچہ علامہ شبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگرچہ ظاہر ہے کہ اس سے قبل کی اسلامی حکومتوں نے بھی ہندوستان کی تہذیب وتمدن کو کچھ نہ کچھ ضرور ترقی دی تھی تاہم بابر نے ترکستان سے آکر ہندوستان کو جس حالت میں دیکھا اس کی تصویر اسی کے لفظوں میں یہ ہے: ''ہندوستان میں اچھے گھوڑے نہیں، اچھا گوشت نہیں، انگور نہیں، خریزہ (خربوزہ) نہیں، برف نہیں، آبِ سرد نہیں، حمام نہیں، مدرسہ نہیں، شمع نہیں (ایسی روشنی جو ہر جگہ ہر موقع سے کام آسکے) مشعل نہیں، شمع دان نہیں، مزید کچھ آگے فرماتے ہیں: باغوں اور عمارتوں میں آب رواں نہیں، عمارتوں میں نہ صفائی ہے، نہ موزونی نہ ہوا، نہ تناسب، عام آدمی ننگے پاؤں لنگوٹی لگائے پھرتے ہیں، عورتیں لنگی باندھتی ہیں جس کا آدھا حصہ کمر سے لپیٹ لیتی ہیں اور آدھا سر پر ڈال لیتی ہیں۔'' (اسلامی حکومت اور ہندوستان میں اس کا تمدنی اثر، ص:۲-۳)

ہندوستان عہدِ اسلامی میں ثریٰ سے ثریا تک

شاہانِ اسلام نے ہندوستان کو اپنا وطن سمجھا اور اس کو ترقی کی سمت گامزن کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا نیز اس کو دیدہ زیب، سونے کی چڑیا اور پرکشش بنانے میں پوری دلچسپی کا مظاہرہ کیا، جس کی مولانا علی میاں ندوی رحمہ اللہ یوں منظر کشی کرتے ہیں: ''مسلمان اگرچہ ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے آئے لیکن اجنبی حکمرانوں کی طرح انھوں نے اس کو محض تجارت کی منڈی اور حصولِ دولت کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ اس کو وطن بنا کر یہیں رس بس گئے اور مرنے کے بعد بھی اس کی خاک کے پیوند ہوئے اس لیے کہ انھوں نے حکومت و سیاست، علم وفن، صنعت وحرفت، زراعت وتجارت، تہذیب ومعاشرت، ہر حیثیت سے اس کو ترقی دے کر صحیح معنوں میں ہندوستان کو جنت نشاں بنادیا۔'' (ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے، ص:۱)

یہی وجہ ہے کہ شہنشاہانِ اسلام نے مختلف مقامات پر تعلیمی ادارے قائم کیے، رفاہِ عام کا مکمل نظم ونسق کیا پھر ڈاک کی راہیں ہموار کیں، مختلف الانواع روزمرہ نیز سردیوں کے کپڑوں کے بے شمار کارخانے بنوائے، تجارت وزراعت کا صحیح زاویہ سکھایا اور متمدن ممالک کے اتصال کا سامان مہیا کیا نیز صنعت وحرفت کو بام عروج تک پہنچایا جس کو علامہ شبلی رحمہ اللہ یوں لفظ کا جامہ پہناتے ہیں: ''ہندو ہمیشہ سے نہایت سادہ لباس پہنتے تھے اور غالباً ان کو گزی گاڑھے کے سوا اور کچھ پہننا نہ آتا ہوگا، (جس کی شہادت گذشتہ سطور میں صراحت سے ملتی ہے) اکبر نے دلی، لاہور، آگرہ، شیخ پور، احمد آباد اور گجرات میں پارچہ بافی کے بڑے بڑے کارخانے جاری کیے اور (یہی نہیں بلکہ) ایران، افغانستان، اور چین سے کاریگر بلوا کر ہر قسم کے قیمتی کپڑے تیار کرائے۔'' (اسلامی حکومت اور ہندوستان میں اس کا تمدنی اثر، ص:۷) اسی طرح اہل ہند کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے جن خوراک کی بھی ضرورت پڑی خواہ باطنی ہو یا ظاہری مسلم حکمرانوں نے اس کو بہم پہنچایا۔ (جاری)

حضرت عبداللہ بن المبارکؒ کا ورع وتقویٰ

امام وقت عبداللہ بن مبارکؒ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ شام کے سفر میں میں نے کسی سے ایک قلم عاریۃً لیا پھر اسے واپس کرنا بھول گیا، جب واپس اپنے وطن ''مرو'' پہونچا تو دیکھا کہ وہ قلم میرے ساتھ آگیا، تو میں دوبارہ سفر کرکے شام گیا اور قلم کے مالک کو اس کا قلم واپس کیا (حالاں کہ اس زمانہ میں یہی لکڑی کے قلم ہوتے تھے، قیمتی قلموں کا تصور بھی نہ تھا) آپ کا مشہور مقولہ ہے کہ ''شبہ کے مال کا ایک درہم رد کرنا میرے نزدیک چھ لاکھ درہم صدقہ کرنے سے بہتر ہے''۔ (مقدمہ کتاب الزہد ۴۵)

یہ اللہ کے مقبول بندوں کے ورع وتقویٰ کی چند جھلکیاں ہیں جن سے بآسانی اس نتیجہ تک پہونچا جاسکتا ہے کہ ان حضرات کو اپنے بلند منصب کا کس قدر خیال تھا اور انہوں نے اپنی دینی عزت بچانے کے لئے کس قدر خواہشات اور لذتوں اور راحتوں کو ترک کرنے کی عادت ڈالی تھی۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ ان کی خدمات میں ایسی برکتیں ظاہر ہوئیں کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی، بعد کے لوگوں میں سے بھی جن خوش نصیب حضرات نے ان پاک باز نفوس کی زندگیوں کو رہنما بنایا اور ان کی صفات اپنانے کی کوششیں کیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بھی قبولیت کے دروازے کھول دئے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ کا نظام حکومت (۳۱)

ایوانِ نمائندگان کی اسٹینڈنگ کمیٹیوں میں ایک اہم کمیٹی قاعدہ اور ضابطہ والی کمیٹی (Committee on Rules) ہے جس میں ایوان کی مختلف پارٹیوں کے نمائندے ایوان میں اپنی ممبرشپ کے تناسب سے شامل ہوتے ہیں۔ اس کمیٹی کا کام ایوان کی کارروائی چلانے کی ضروری اور مناسب قاعدے اور ضابطے بنانا ہوتے ہیں۔ ایوان کا اسپیکر وقتاً فوقتاً منتخبہ کمیٹیوں کو مقرر کرتا ہے۔ یہ کمیٹیاں خاص خاص مقصد کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ کسی بل کے سلسلے میں سینیٹ سے اختلافِ رائے ہونے کی صورت میں اس سے یعنی سینیٹ سے گفتگو کرنے اور اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ایک کانفرنس کمیٹی بنائی جاتی ہے جو تین سے لے کر نو ممبروں تک مشتمل ہوتی ہے۔ اس طرح سینیٹ کی بھی کمیٹی ہوتی ہے۔ جن بلوں کے بارے میں شدید اختلافِ رائے ہو ان پر غور کرنے کے لیے پورا ایوان، سارے ہاؤس یا ایوان کی کمیٹی (Committee of the Whole House) کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس کی کارروائی کو چلانے کے لیے قاعدے بہت زیادہ سخت نہیں ہوتے۔ اس کی صدارت اسپیکر نہیں کرتا بلکہ وہ کسی دوسرے ممبر کو اس کا صدر نامزد کرتا ہے۔ فیصلے ہاتھ اُٹھا کر کیے جاتے ہیں۔

برطانوی اور امریکن کمیٹی سسٹم میں فرق

برطانوی کمیٹی بلوں پر صرف نظر ثانی کرتی ہے لیکن امریکن اسٹینڈنگ کمیٹیاں ہی اصل قانون سازی کا کام کرتی ہیں۔ وہ بلوں کی شکل اور نوعیت تک بدل دیتی ہیں۔ ایوان میں بحث ومباحثہ محض رسمی قسم کا ہوتا ہے، اس لحاظ سے امریکن کمیٹی کہیں زیادہ بااختیار اور مضبوط ہوتی ہے۔ برطانوی کمیٹیوں کے چیئرمین پارٹی بازی سے الگ رہ کر اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ برعکس اس کے امریکن کمیٹیوں کے چیئرمین ہر چیز کو پارٹی کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ برطانوی کمیٹیاں کابینہ کی قیادت میں کام کرتی ہیں لیکن امریکن کمیٹیوں کی قیادت ان کے چیئرمین کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

گاہے گاہے باز خواں......

ہفت روزہ الجمعیۃ ۱۶ سال پہلے

ماضی کے جھروکوں سے حال پر روشنی ڈالتے ہوئے مستقبل کا اشاریہ!

ہفت روزہ الجمعیۃ نئی دہلی

۳۱ مارچ تا ۶ اپریل ۲۰۰۶ء

اقلیتی وزارت کا قیام فرقہ پرستوں کے پیٹ میں مروڑ کیوں

۲۰۰۶ء میں یوپی اے کی منموہن سنگھ حکومت کابینہ میں ایک اقلیتی وزارت قائم ہوئی جو اس کے انتخابی منشور میں کیے گئے وعدہ کی تکمیل تھی مگر فرقہ پرستوں کو اس کی بڑی تکلیف محسوس ہوئی، ہفت روزہ الجمعیۃ کے مدیر تحریر ایم ایس جامعی نے ایک اداریہ سپردِ قلم کیا تھا جو حسب ذیل ہے۔

یہ ایک عجیب وغریب بات ہے کہ ہندستان کی فسطائی طاقتیں تو اقلیت دشمنی کے مظاہرہ میں پیش پیش رہتی ہی ہیں، وہ پارٹیاں، تنظیمیں اور ادارے بھی جو خود کو سیکولر کہتے ہیں اور اپنے اوپر فسطائیت کا لیبل بھی لگانا نہیں چاہتے مسلمانوں کو عملاً کوئی فائدہ ہوتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے اور اگر کسی حلقہ سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہوا نظر آجائے خواہ اس کا تعلق محض سیاست، دِکھاوے اور انتخابی وعدہ سے ہی کیوں نہ ہو یہ نام نہاد سیکولر ادارے بھی اس پر نہ صرف بے چین ہوجاتے ہیں بلکہ اس کے خلاف میدان میں آکر اسے بڑی مکاری کے ساتھ مسلمانوں کی منہ بھرائی بھی قرار دینے لگتے ہیں، جس کا فائدہ مسلمانوں کے بجائے فرقہ پرستوں اور فسطائی عناصر کو ہی ہوتا ہے اور مسلمان محرومی ونامرادی کا شکار ہوکر رہ جاتے ہیں۔

گذشتہ ماہ وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کی طرف سے اپنی وزارت میں توسیع کے وقت ایک اقلیتی وزارت کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم اور ان سے متعلق دوسرے مسائل کو جو ابھی تک مختلف وزارتوں کے تحت آتے تھے ایک وزارت کے تحت لاکر ان کے حل کی کوشش کی جائے۔ مسلمانانِ ہند کا یہ ایک قدیم مطالبہ بھی تھا۔ یوپی اے حکومت نے اسے تسلیم کرتے ہوئے ''اقلیتی امور کی وزارت'' کے نام سے ایک وزارت قائم کردی اور حالانکہ ابھی تک اسے تفصیل کے ساتھ اقلیتی امور پورے طور پر حوالہ بھی نہیں کیے جاسکے ہیں مگر نہ صرف فرقہ پرست فاشی عناصر بلکہ خود کو سیکولرزم کا خادم کہنے والے لوگ بھی حکومت کے اس قدم پر چراغ پا نظر آرہے ہیں۔ حکومت کے اس فیصلہ پر جہاں فسطائی طاقتیں یوپی اے حکومت پر مسلمانوں اور اقلیتوں کی منہ بھرائی کا الزام لگا رہی ہیں وہ نام نہاد سیکولر اخبارات حسب روایت اس فیصلہ کو مسلمانوں کے علاحدگی پسندی کے جذبہ کو فروغ دینے اور ملک کو ایک اور تقسیم کی طرف دھکیلنے کی کوشش قرار دینے میں لگے ہوئے ہیں۔

ابھی حال ہی میں خود کو سیکولر کہنے اور سیکولرزم کا ڈھنڈورہ پیٹنے والے انگریزی اخبار ''ٹائمز آف انڈیا'' نے حکومت کے اس قدم پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ معاصر موصوف نے کابینہ کے سیکریٹریٹ کے اس فیصلہ کو ملک کو غیر منطقی انداز میں تقسیم کرنے والا قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ اس نئی وزارت کی تخلیق کو امید افزا اور خوش آئند نظروں سے دیکھ رہے ہیں، انھیں اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ قدم نہ ملک کے حق میں مفید ہے اور نہ ہی اقلیتوں کے حق میں۔ اخبار نے یہ الزام بھی لگایا ہے کہ اس اقدام کا مطلب یہ ہے کہ حکومت مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو ملک کے انسانی وسائل کا حصہ تصور نہیں کرتی۔ یہ ایک افسوسناک صورتحال ہے کہ جس حکومت کو اقلیتوں کو قومی دھارے میں لانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی وہ ان سے متعلق امور ومعاملات کو ایک علیحدہ وزارت کے حوالہ کرکے خود ان کو الگ تھلگ گندی بستیوں میں دھکیلنے کی کوشش کررہی ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ جب سے نہ صرف ہندستان بلکہ پورے برصغیر میں فسطائی طاقتوں نے سر اُبھارنا شروع کیا ہے وہ ہر لمحہ ہر پل اور ہر قدم پر طرح طرح سے ایسی تدابیر کرتی رہتی ہیں کہ مسلمانوں کو جس طرح بھی ہو دوسرے درجہ کا شہری اور پسماندہ بنا کر رکھ دیا جائے اور انھیں کچل کر اس مقام پر پہنچا دیا جائے کہ وہ اس ملک کے آزاد باشندے اور مساوی حقوق کا دعویٰ کرنے کے لائق شہری بن کر نہ رہ سکیں۔ معاملہ تعلیم کا ہو یا سیاست کا، اقتصادیات کا ہو یا معاشرت کا، ان کے تمام منصوبوں کی تان اس مقام پر آکر ٹوٹتی ہے کہ یہاں رہنے والے مسلمانوں کو ہر طرح کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا جائے۔ انھیں اس ملک میں سر اُٹھا کر چلنے کے قابل نہ رہنے دیا جائے۔ انھیں انسانوں کے زمرہ میں بھی نہ شمار کیا جائے بلکہ انھیں جانوروں سے بھی بدتر کسی مخلوق کی حیثیت میں پہنچا دیا جائے۔

معاصر مذکور نے جس طرح مسلمانوں کو الگ تھلگ ڈالنے کی کوشش کی بات کہی ہے، ہر شخص بخوبی جانتا اور سمجھتا ہے کہ فسطائی طاقتوں اور ان کے در پردہ نام نہاد اعتدال پسند حامیوں نے مسلمانوں کو اس مقام سے بھی کہیں زیادہ بدتر حالت میں پہنچا دیا ہے، جس کا اعتراف واقرار مختلف سروے رپورٹوں، تحقیقاتی کمیشنوں اور انکوائری کمیٹیوں کے ذریعہ ایک دو بار نہیں گزشتہ نصف صدی کے دوران سینکڑوں بار کیا جاچکا ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ باوجود اس کے کہ آئین ہند میں اقلیتوں کے حقوق واضح طور پر متعین کردیئے گئے ہیں۔ آج تک عملاً وہ ان تمام حقوق سے محروم ہی ہیں۔ نہ انھیں مذہبی، تعلیمی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی تحفظ حاصل ہے اور نہ ہی انھیں عملی طور پر ملک کا مساوی درجہ کا شہری تصور کیا جاتا ہے۔ ان کی بستیوں اور آبادیوں کو اسکولوں سے محروم رکھا جانا ہے تاکہ وہ تعلیم کے میدان میں آگے نہ بڑھ سکیں۔ انھیں معاشی واقتصادی اسکیموں سے بھی دور ہی رکھا جاتا ہے تاکہ وہ معاشی طور پر خوشحال نہ ہوجائیں۔ ان کے قائم کردہ اداروں کے ساتھ بھی امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ ان کے دینی مدارس اور عبادت گاہوں کو دہشت گردی کے اڈّے قرار دے کر بدنام کیا جاتا ہے۔ حکمراں اپنے سیاسی مفادات کی خاطر اور خود کو اقلیتوں کا ہمدرد وبہی خواہ ظاہر کرنے کے لیے طرح طرح کے اعلانات کرتے ہیں مگر عمل کی دنیا میں کبھی خود پس پردہ رہ کر اور کبھی فسطائیت کا سہارا لے کر سرکاری اداروں اور افسروں کو ایسی ہدایات دے دی جاتی ہیں کہ مسلمانوں کو ان اسکیموں اور اعلانات کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ پاتا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ''ٹائمز آف انڈیا'' جیسے کثیر الاشاعت اخبار کو حکومت کے اس قدم پر کیوں نکتہ چینی کی ضرورت پیش آگئی جبکہ ابھی حکومت کے اس اقدام کا کوئی مثبت یا منفی پہلو بھی سامنے نہیں آسکا ہے، مگر یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ اگر مسلمانوں کو آئین میں دیئے گئے حقوق و مراعات سے ایمانداری کے ساتھ مستفید ہونے کا موقع دے دیا جائے تو نہ ان کیلئے کسی وزارت کی ضرورت ہوگی اور نہ ہی ''ٹائمز آف انڈیا'' جیسے اخبار کو اس پر نکتہ چینی کرنے کا موقع ملے گا اور پھر نہ ہی کوئی فسطائی طاقت کو ملک کے سیکولر چہرہ کو داغدار کرڈالنے کی جرأت ہوگی۔

عالمِ اسلام

کعبہ کی چھت پر نصب سنگ مرمر کی مرمت کا کام جاری

حرمین شریفین انتظامیہ نے کعبہ کی چھت پر نصب سنگ مرمر کی مرمت کا کام کیا جا رہا ہے۔ سبق ویب سائٹ کے مطابق انتہائی اعلیٰ کوالٹی کے مواد اور ماہر فنی ٹیم سے کام لیا جا رہا ہے۔ انتظامیہ نے کہا ہے کہ سنگ مرمر کی مرمت کا کام معمول کے مطابق کیا جا رہا ہے جس میں فنی ٹیم اعلیٰ معیار کی جانچ پڑتال کر رہی ہے۔ کعبے کی چھت پر غلاف ثبت کرنے کے مقامات کی سلامتی، پتھروں کی کوالٹی اور دو پتھروں کے درمیان خالی جگہ کو مخصوص مادے سے پر کرنے کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ انتظامیہ کے تحت مرمت کے شعبے کے سربراہ انجینئر عامر بن عوض لقمانی نے کہا ہے کہ کعبے کی چھت پر انتہائی نادر اور اعلیٰ کوالٹی کا سنگ مرمر ہے۔ اس پتھر کو تاسوس کہا جاتا ہے اور یہ خصوصی طور پر بیرون ملک سے درآمد کیا جاتا ہے۔ اس پتھر کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سورج کی گرمی جذب کرتا ہے اور روشنی منعکس کرتا ہے۔ انتہائی گرم دھوپ میں بھی یہ پتھر ٹھنڈا رہتا ہے جبکہ بہت پائیدار اور مضبوط بھی ہے۔

بیرونی عمرہ زائرین کی ’قدوم‘ پورٹل میں رجسٹریشن ضروری

سعودی وزارت حج وعمرہ نے بیرون مملکت سے عمرہ پر آنے والوں سے کہا ہے کہ وہ آنے سے قبل ’قدوم‘ پلیٹ فارم پر ویکسین کی رجسٹریشن کریں۔ اخبار ۲۴ کے مطابق وزارت حج وعمرہ نے مملکت آنے والے عمرہ زائرین سے کہا ہے کہ وہ سعودی عرب آنے سے ۷۲ گھنٹے قبل آن لائن ’قدوم‘ پلیٹ فارم پر ویکسی نیشن کے بارے میں معلومات اپ لوڈ کریں۔ قدوم پلیٹ فارم پر اکاؤنٹ بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وزارت داخلہ کے ہوم پیج پر ابشر پلیٹ فارم پر قدوم کا پورٹل موجود ہے جسے کلک کرنے پر اس کا پیج کھل جاتا ہے۔ واضح رہے سعودی عرب میں کورونا سے بچاؤ کے لیے فائزر بائیونٹک، ایسٹرازینیکا، جانسن اینڈ جانسن اور موڈرنا ویکسین فراہم کی جا رہی ہے۔ علاوہ ازیں عالمی ادارہ صحت کی جانب سے منظور کردہ سائنوویک اور سائنوفام ویکسین کو بھی سعودی عرب میں منظور کیا گیا ہے۔ وہ افراد جنھوں نے مملکت میں ویکسین کا کورس مکمل نہیں کیا انہیں سعودی عرب آنے کے بعد مقررہ ویکسین کی بوسٹر ڈوز دی جاتی ہے جبکہ ایسے افراد جنھوں نے اپنے ملکوں میں ویکسین لگائی ہے انہیں سعودی عرب آنے کے بعد ۵ دن قرنطینہ میں گزارنے ہوتے ہیں۔

سوڈان نے الجزیرہ چینل کا لائسنس منسوخ کر دیا

سوڈان نے قطر میں قائم ٹیلی ویژن نیٹ ورک الجزیرہ کا لائسنس منسوخ کر دیا ہے۔ اے ایف پی نیوز ایجنسی کی رپورٹ کے مطابق لائیو ٹیلی ویژن چینل پر سوڈان میں ہونے والی حالیہ فوجی بغاوت کے خلاف مظاہروں کی غیر پیشہ ورانہ کوریج کا الزام لگایا گیا ہے۔ نیوز چینل نے اتوار کے روز ٹویٹ میں کہا ہے کہ سوڈانی حکام نے اعلان کیا ہے کہ انھوں نے الجزیرہ لائیو چینل کی نشریات کی منظوری روک دی ہے اور چینل کی ٹیم کو سوڈان میں کام کرنے سے منع کر دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ ۲۵/اکتوبر کو سوڈان کی فوج کے سربراہ جنرل عبدالفتاح البرہان کی بغاوت کے بعد سے سوڈان سیاسی بحران کا شکار ہے۔ سوڈان میں اقتدار پر فوجی قبضے کے بعد وہاں پر جمہوریت کی حامی تحریکوں کے ذریعے بڑے پیمانے پر احتجاج کا آغاز ہوا۔

جمہوری ہندستان میں آر ایس ایس کا ہندو راشٹر کا منصوبہ

نتائج کیا ہوں گے؟

تحریر: **ڈاکٹر انور ادیب**

آر ایس ایس (راشٹریہ سویم سیوک سنگھ) ایک فسطائی تنظیم ہے۔ حالانکہ خود کو یہ تنظیم ایک ثقافتی تنظیم کہتی ہے لیکن اس کی سرگرمیاں اس کی تائید نہیں کرتی ہیں۔ اس تنظیم کا قیام ۱۹۲۵ء میں عمل میں آیا۔ اس کے بانی ناگپور کے ڈاکٹر کیشو بلی رام ہیڈ گیوار (۱۸۸۹ء-۱۹۴۰ء) ہیں جو اس کے پہلے سر سنگھ چالک تھے۔ ان کا مقصد ہندستان کو ایک ہندو راشٹر بنانا تھا۔ اپنے نظریات کی وضاحت انھوں نے اپنی تصانیف A Bunch of Thoughts اور We Nationhood Defined میں کی ہے۔

آر ایس ایس کے نظریات کو فروغ دینے میں ایم ایس دیورس (۱۹۱۵ء-۱۹۹۶ء) کا رول بھی اہم رہا ہے۔ یہ آر ایس ایس کے تیسرے سر سنگھ چالک تھے۔ وہ ایک معروف صحافی تھے۔ انھوں نے مراٹھی روزنامہ ’ترون بھارت‘ اور ہندی روزنامہ ’یوگ دھرم‘ کی ادارت کی اور ان روزناموں کے ذریعہ آر ایس ایس کے نظریات کی زبردست تشہیر کی۔ ۱۹۶۵ء میں وہ آر ایس ایس کے جنرل سکریٹری بنے اور ۱۹۷۳ء میں ایم ایس گولوالکر کے مرنے کے بعد سر سنگھ چالک بنائے گئے۔ ان کے دور میں آر ایس ایس نے کافی ترقی کی۔ جواہر لعل نہرو کے بعد لال بہادر شاستری ملک کے وزیر اعظم ہوئے۔ وہ نہرو کی طرح قدآور نہیں تھے اس لیے آر ایس ایس نے آسانی سے ان پر غلبہ حاصل کر لیا۔ پہلی بار ولبھ بھائی پٹیل کی جینتی راشٹر پتی بھون میں منائی گئی جس میں آر ایس ایس کے سربراہ گرو گولوالکر بھی شریک ہوئے۔ اس طرح پہلی بار آر ایس ایس کے سربراہ کو راشٹر پتی بھون میں داخلہ کا موقع ملا۔ ۱۹۶۵ء میں ہندو پاک کی جنگ میں آر ایس ایس نے دلّی ٹریفک نظام کو اپنے ذمہ لے لیا۔ سڑکوں پر آر ایس ایس سویم سیوک ٹریفک کنٹرول کرتے تھے۔ اس طرح پہلی بار آر ایس ایس کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی اور سے وہ درجہ حاصل ہوا جس کا وہ نہرو کے دور میں تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ شاستری کے بعد اندرا گاندھی آئیں۔ وہ نہرو کے افکار کی وارث تھیں۔ آر ایس ایس کو پھر اپنے خول میں سمٹنا پڑا لیکن جب اندرا گاندھی نے ایمرجنسی نافذ کی اور سارے مخالف لیڈروں کو قید کر دیا تو آر ایس ایس کو بڑا فائدہ ہوا۔ اس کے سیاسی بازو بھارتیہ جن سنگھ (جسے آر ایس ایس کے شیاما پرشاد مکھرجی نے ۱۹۵۱ء میں قائم کیا تھا) کو قومی سیاست میں جگہ مل گئی۔ ایمرجنسی کے بعد جب جنتا پارٹی کی حکومت بنی تو جن سنگھ اس میں ایک شریک پارٹی تھی۔ اس کے لیڈر لال کرشن ایڈوانی مرکز میں وزیر بنے۔ اس طرح پہلی بار آر ایس ایس کو مرکز میں اقتدار میں آنے کا موقع ملا۔

واضح رہے کہ آر ایس ایس اپنی ابتدا ۱۹۲۵ء ہی سے ہندستان کو ہندو راشٹر بنانے میں سرگرم تھی۔ ہندستان کو ہندو راشٹر بنانا ہی اس کا اہم ایجنڈا تھا جس کے حصول کے لیے زبردست حکمت عملی سے کام کر رہی تھی۔

کانگریس میں شروع ہی سے دو لابی برسرپیکار تھی۔ قدامت پسند ہندو اور ترقی پسند ہندو۔ بال گنگا دھر تلک، مدن موہن مالویہ، لالہ لاجپت رائے وغیرہ قدامت پسندوں کی نمائندگی کرتے تھے جبکہ موتی لال نہرو، دیش بندھو چترنجن داس، آچاریہ نریندر دیو ترقی پسند لابی سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد کو قدامت پسند لابی کی قیادت ولبھ بھائی پٹیل کو ملی۔ اس لابی میں کٹروادی عناصر پرشوم داس ٹنڈن، سمپورنانند وغیرہ شامل تھے۔ ہندووادی لابی میں ایک گروپ قدامت پسند لیکن اعتدال پسند لیڈروں کا تھا۔ اس میں ڈاکٹر راجندر پرشاد، لال بہادر شاستری، گووند ولبھ پنت جیسے لوگ شامل تھے جو ہندوواد کے حامی ہونے کے باوجود متعصب نہیں تھے۔ اس لابی کے مقابل ترقی پسند سیکولر لابی تھی، جس کی قیادت جواہر لعل نہرو کے ہاتھ میں تھی۔ اس میں کانگریس کا نوجوان سوشلسٹ طبقہ بھی تھا۔ چندر شیکھر، رام منوہر لوہیا، موہن دھاریہ وغیرہ جواہر لعل نہرو کے ساتھ تھے۔ دوسرے کانگریس قائدین مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی اور بیرسٹر آصف علی شامل تھے۔ مسلم قائدین کے اس گروپ کو نیشنلسٹ مسلم کہا جاتا تھا تاکہ ان قائدین کو مسلم لیگ کے دو قومی نظریہ کے حامل لیڈروں سے الگ سمجھا جائے۔ جواہر لعل نہرو کے گروپ میں سبھاش چندر بوس اور راج گوپال آچاریہ وغیرہ بھی تھے۔ ان گروپوں میں خفیہ و اعلانیہ طور پر کشمکش جاری رہتی تھی۔ پٹیل بہت دبنگ سیاست داں تھے۔ وہ سیٹھ بھگوان داس، پرشوتم داس ٹنڈن اور سمپورنانند کی طرح کٹروادی نہیں تھے، پھر بھی ہندوواد کے حامی تھے۔ پٹیل اس وقت وزیر داخلہ تھے۔ گاندھی جی کے قاتل ناتھورام گوڈسے کا تعلق آر ایس ایس سے تھا۔ پٹیل نے آر ایس ایس پر پابندی لگا دی۔ اسی پٹیل نے اپنی نگرانی میں سومنات کے مندر کی ازسرنو تعمیر کرائی اور صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد سے اس کا افتتاح کرایا۔ پنڈت نہرو کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ ان کے نزدیک سیکولر ہندستان کے صدر کا کسی مندر کا افتتاح کرنا مناسب نہیں تھا لیکن پٹیل نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ ملک کو ہندو راشٹر کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آر ایس ایس روز اوّل ہی سے اپنے ہندو راشٹر کے ایجنڈے پر عمل پیرا رہی ہے۔ تاریخ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دو قومی نظریہ کا بانی ویر ساورکر (۱۸۸۳ء-۱۹۶۶ء) تھا۔ اس نے اپنی کتاب Essentials of Hindutva میں ہندوتوا کا ذکر تفصیل سے کیا ہے جس سے ان کے فسطائی نظریہ کا پتہ چلتا ہے جو ہٹلر کے Nazism اور مسولینی کے Fascism سے مماثل ہے۔ ساورکر کی یہ کتاب شاید اطالوی سیاستداں مازینی (Mazzini) (۱۸۰۵ء-۱۸۷۲ء) کے افکار سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔

> **گاندھی جی مذہبی رہنما نہیں تھے۔ وہ سیاستداں تھے لیکن ان پر ہندو دھرم کا گھرا رنگ تھا۔ وہ بڑے پکے اور سچے ہندو تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آزاد ہندستان میں وہ حضرت عمرؓ کا دور حکومت دیکھنا چاہتے ہیں گاندھی جی خود کو ہندو نیشنلسٹ نہیں کہتے تھے لیکن انسانیت کے علمبردار تھے۔ ہندو دھرم کے سچے ترجمان تھے۔ وہ لبرل تھے۔ فرقہ وارانہ تشدد اور تنگ نظری سے بہت دور تھے۔**

آر ایس ایس کی فسطائی ذہنیت کا اظہار مختلف طرح سے ہوتا رہتا ہے مثلاً اس کا یہ کہنا کہ ہندستان میں رہنے والا ہر شخص ہندو ہے جبکہ وہ ہندستان کا باشندہ ہونے کے اعتبار سے ہندستانی یا بھارتی یعنی انڈین ہے نہ کہ ہندو۔ یورپ میں عیسائیت کا غلبہ ہے، حکمراں بھی عیسائی ہوتے ہیں لیکن وہاں ایسا تنازعہ پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ آر ایس ایس پیدا کر رہی ہے۔

ہندستان کے ہندو راشٹر نہ ہونے کے باوجود یہ ایک ہندو راشٹر ہے۔ سرکاری تقاریب میں بھومی پوجن، جہاز سمندر میں اتارے جانے پر ناریل پھوڑنا، سرکاری تقریبات میں سرسوتی وندنا گانا ہندو راشٹر کی ہی تو علامات ہیں۔ اس کے باوجود آر ایس ایس ہندستان کو ہندو راشٹر بنانے پر بضد ہے۔ شاید وہ آئینی طور پر اسے ہندو راشٹر بنانا چاہتی ہے۔ اس لیے آئین میں تبدیلی کی بات کی جاتی ہے۔

آر ایس ایس شاید ہندستان میں اسپین کی تاریخ دہرانا چاہتی ہے۔ اسرائیل سے اس کے قریبی تعلقات سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اسرائیل ایک دہشت گرد اور نسل پرست ملک ہے جس نے فلسطینی عربوں کی سرزمین پر قبضہ کر کے انھیں کیمپوں میں رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ آر ایس ایس کا جارحانہ رویہ اس بات کا غماز ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے حق سے محروم کر کے انھیں دوسرے درجہ کا شہری بنانا چاہتی ہے۔ برطانیہ ایک عیسائی ملک ہے۔ وہاں کا تاجدار مذہبی پیشوا بھی ہوتا ہے اور کلیسائے انگلستان کا سربراہ بھی۔ اس کے باوجود برطانیہ ایک لبرل مذہبی ریاست ہے۔ برطانوی نظام آر ایس ایس کے لیے ایک چشم کشا مثال ہو سکتا ہے۔ ہندستان سے ان کی محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اس مثال سے سبق لے۔

سوامی وویکانند ایک عظیم اسکالر تھے۔ وہ اسلام اور ہندو دھرم کی روحانیت کے امتزاج سے ایک نیا معاشرہ تشکیل دینا چاہتے تھے۔ ۱۸۹۵ء میں شکاگو میں عالمی مذاہب کانفرنس میں شرکت کے بعد انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا۔ آر ایس ایس سوامی وویکانند کا بے حد سمان کرتی ہے۔ کیا وہ ان کے اس خیال کو اپنانا پسند کرے گی؟

گاندھی جی مذہبی رہنما نہیں تھے۔ وہ سیاستداں تھے لیکن ان پر ہندو دھرم کا گہرا رنگ تھا۔ وہ بڑے پکے اور سچے ہندو تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آزاد ہندستان میں وہ حضرت عمرؓ کا دورِ حکومت دیکھنا چاہتے ہیں گاندھی جی خود کو ہندو نیشنلسٹ نہیں کہتے تھے لیکن انسانیت کے علمبردار تھے۔ ہندو دھرم کے سچے ترجمان تھے۔ وہ لبرل تھے۔ فرقہ وارانہ تشدد اور تنگ نظری سے بہت دور تھے۔ آر ایس ایس چاہے تو ہندستان سوامی وویکانند اور گاندھی جی کے خوابوں کی تعبیر بن سکتا ہے لیکن اس کے لیے اسے اپنے فسطائی نظریات کو خیرباد کہنا ہوگا۔ کیا آر ایس ایس کے رہنما بھارت ماتا کو تباہی سے بچانے کے لیے ایسا نہیں کر سکتے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہر وہ ہندستانی جاننا چاہے گا جسے ہندستان سے محبت ہے جو اسے تباہی سے بچانا چاہتا ہے۔ ہندستان اپنی گنگا جمنی تہذیب کی وجہ سے ساری دنیا میں ایک امتیازی حیثیت کا مالک ہے۔ کیا بھارت ماتا کی اس امتیازی شان کو قائم رکھنے کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی؟ آیئے ہم اس پر سنجیدگی سے غور کریں۔ □□

قومی ایکتا

مجیب بستوی

دیش کا روشن کرے گی نام قومی ایکتا
سب کا ہونا چاہیے پیغام قومی ایکتا
اس طرح آؤ کریں ہم عام قومی ایکتا
صبح قومی ایکتا ہو شام قومی ایکتا
زندگی میں اتحادِ باہمی پیدا کرو
سب سے وابستہ رہو وابستگی پیدا کرو

خدمتِ قوم و وطن ہوگی تمھارے کام سے
انجمن پھر انجمن ہوگی تمھارے کام سے
ٹھوس بنیادِ چمن ہوگی تمھارے کام سے
ایک دن دُنیا مگن ہوگی تمھارے کام سے
ایکتا کا لے کے پرچم ہاتھ میں آگے بڑھو
اور سب کو لے کے اپنے ساتھ میں آگے بڑھو

خضر راہِ منزلِ مقصود بن جاؤگے تم
اپنی دُنیا میں بہارِ زندگی لاؤگے تم
قوم کو جلوے خود آگاہی کے دِکھلاؤگے تم
اتحادِ باہمی کے گیت جب گاؤگے تم
متحد ہو کر قدم آگے بڑھانا ہے تمھیں
ظلم و استبداد سے پنجہ لڑانا ہے تمھیں

تم سے میدانِ عمل میں کوئی بڑھ سکتا نہیں
آسماں کہتا ہے تم سے تم سے کہتی ہے زمیں
تم محبت کے پیمبر تم شجاعت کے امیں
غیر کے آگے تمھاری جھک نہیں سکتی جبیں
ہر گلی میں ہے مجیبؔ بستوی اس کی پکار
ایکتا میں ہے نہاں ہر کامرانی کی بہار

جمہوریت میں اقلیت واکثریت نہیں اعمال فیصلہ کن ہوتے ہیں

تحریر: مولانا اسعد اعظمی، بنارس

بہت سارے لوگ جب اس پہلو پر غور کرتے ہیں کہ جمہوری وطن عزیز میں ہم اقلیت میں ہیں، ہم صرف بیس فیصد ہیں اور یہاں کے باقی ۸۰ فیصد غیر مسلم ہیں تو ایک طرح سے فکرمندی اور مایوسی کا شکار ہوتے ہیں اور خدشات اور اندیشوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ شرعی اور تاریخی وسماجی اعتبار سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا واقعی اقلیت میں ہونا تشویش کی بات ہے؟ اور کیا تعداد کی قلت ہمیشہ شکست وریخت کا سبب ہوتی ہے؟

اس دُنیا کی پوری آبادی کا جائزہ لیں گے تو دیکھیں گے کہ سینکڑوں ادیان ومذاہب اور رجحانات ومشارب کے لوگ اس کرۂ ارضی پر بستے ہیں۔ عالمی پیمانے پر تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ عیسائی ہیں، دوسرے نمبر پر اہل اسلام ہیں۔ عالمی آبادی کے اعتبار سے بھی مسلمان محض ۲۰ فیصد ہی ہیں، بقیہ ۸۰ فیصد میں دوسرے مذاہب اور خیالات کے لوگ ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہندستان میں مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود عالمی پیمانے پر تعداد کی کثرت کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر ہیں۔ پہلے نمبر پر مسلم ملک انڈونیشیا ہے جہاں سب سے زیادہ مسلمان آباد ہیں اور دوسرے نمبر پر ہندستانی مسلمان ہیں جو اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی مسلم اکثریت کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر ہیں۔

کتاب وسنت کی نصوص کے ساتھ حق اور اہل حق کی تاریخ کو سامنے رکھیں تو یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ ہمارے لیے اقلیت میں ہونا کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ ہم نے کبھی نہ تو تعداد کی کثرت پر بھروسہ کیا نہ قلب پر افسوس کیا۔ ہمارے لیے اصل چیز ایمان کی طاقت اور عقیدے کی مضبوطی ہے۔ اگر ہماری تعداد بہت زیادہ ہو، مگر ایمان اور عقیدہ وعمل میں کمزور ہوں تو تعداد کی کثرت ہمارے کام نہ آسکے گی۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ یہی بات سمجھائی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”بسا اوقات ایک چھوٹی جماعت اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب آجاتی ہے۔“ (سورہ بقرہ:۲۴۹)

یہاں غور کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ غلبہ اللہ کے حکم اور اس کی مشیت سے ہوتا ہے، ہماری قلت یا کثرت سے نہیں۔ ایک مقام پر ہے: ”میرے بندوں میں سے تھوڑے لوگ ہی شکر گزار ہوتے ہیں۔“ (سورہ سبا:۱۳)

ایک جگہ ہے: ”ایمان اور عمل صالح والے تھوڑے ہی ہیں۔“ (سورص:۲۴)

دوسری طرف اکثریت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: ”اے نبی! آپ کی خواہش کے باوجود لوگوں کی اکثریت ایمان لانے والی نہیں۔“ (سورہ یوسف:۱۰۳)

”اگر روئے زمین پر بسنے والوں میں سے اکثریت کی بات مانیں گے تو وہ آپ کو اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔“ (سورہ انعام:۱۱۶)

غزوہ حنین میں مسلمانوں کی تعداد ماضی کے مقابلے میں کچھ زیادہ تھی، کسی کی زبان سے اس طرح کی بات نکل گئی کہ آج ہم کثرتِ تعداد کی وجہ سے شکست نہیں کھا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ توبہ میں اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ”یقیناً اللہ تعالیٰ نے بہت سے میدانوں میں تمھیں فتح دی ہے اور حنین کی لڑائی والے دن بھی جبکہ تمھیں اپنی کثرت پر ناز ہوگیا تھا، لیکن اس کثرت نے تمھیں کوئی فائدہ نہ دیا بلکہ زمین باوجود اپنی کشادگی کے تم پر تنگ ہوگئی۔“ (سورہ توبہ:۲۵)

اگر ہم عہد نبوی اور اس کے بعد میں ہونے والی جنگوں کے فریقین کی تعداد کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اکثر جنگوں میں مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کے بہ مقابل کم رہی، جیسے غزوہ بدر میں مسلمان ۳۱۳، دشمن ۱۰۰۰، غزوہ اُحد میں مسلمان ۶۵۰، دشمن تین ہزار، غزوہ احزاب میں مسلمان تین ہزار، دشمن دس ہزار، غزوہ خیبر میں مسلمان چودہ سو، دشمن دس ہزار، غزوہ موتہ میں مسلمان تین ہزار، دشمن ایک لاکھ یا دو لاکھ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک لڑائی جلولا کی لڑی گئی۔ اس میں مسلمانوں کی تعداد تیس ہزار تھی اور فارس کا لشکر جرار ایک لاکھ پر مشتمل تھا۔ اس میں سینکڑوں ہاتھی تھے جو ایرانی لشکر کے آگے چلتے تھے، اس میں ایک سفید ہاتھی سب سے آگے تھا، پہلے امیر لشکر رستم کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ تم لوگ لوٹ جاؤ، اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو، ہر سپاہی اور امیر لشکر کو بطور انعام اتنی اتنی رقم دی جائے گی، مسلمانوں کے امیر لشکر نے فرمایا کہ ہم اللہ کے راستے میں موت کو اسی طرح عزیز رکھتے ہیں جس طرح تم کو زندگی عزیز ہے۔ فارس کے امیر لشکر رستم نے کہا کہ تمہارے پاس نہ گنتی میں کافی لوگ ہیں اور نہ ساز وسامان ہی ہے اور نہ قوت و ہتھیار ہے۔ بالآخر جنگ جاری ہوگئی۔ ہاتھیوں کے قطار سے سفید ہاتھی آگے بڑھا اور دو چار مقابل میں آنے والے فوجیوں کو ہلاک کر دیا تو مسلمان فوجیوں کے اندر خوف وہراس کی لہر دوڑ گئی۔ انھوں نے سوچا کہ یہ ہاتھیوں کی لڑائی ہے، آخر ہم کس طرح کامیاب ہوسکتے ہیں؟ تو دو نوجوانوں میں یہ بات چیت ہوئی کہ تم کل ایک نیزہ لے کر سفید ہاتھی کی آنکھ میں بھونک دو اور میں ایک تلوار لے کر سونڈ پر اس طرح ماروں گا کہ سونڈ مستک سے کٹ کر الگ گر جائے گی۔ چنانچہ اس پروگرام سے دونوں نوجوان ہاتھی کے سامنے آئے، سفید ہاتھی کی آنکھ میں ایک نے نیزہ مارا اور دوسرے نے تلوار سے ایسی کاری ضرب لگائی کہ سونڈ کٹ کر مستک سے الگ ہوگئی۔ سفید ہاتھی اپنے ہاتھیوں کی طرف بھاگا اور تمام ہاتھی فوجیوں کی طرف بھاگے جس سے فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور مسلمان حملہ آور فوجیوں پر ٹوٹ پڑے۔ تمام میدان خالی ہونے لگا اور مسلمان صحابہ نے ان کا پیچھا مدائن ونہاوند تک کیا۔ مدائن ونہاوند بھی اسی وقت فتح ہوگیا۔ (ماہنامہ محدث بنارس، شیخ الحدیث نمبر، جنوری-فروری ۱۹۹۷ء) ص ۱۰۳-۱۰۴، بحوالہ کتاب الخراج للقاضی ابی یوسف)

یرموک کی جنگ کا معاملہ بھی بڑا عبرتناک ہے۔ یہ جنگ باختلاف روایت ۱۳ھ (عہد صدیقی میں) یا ۱۵ھ (عہد فاروقی) میں لڑی گئی۔ اس میں مسلمانوں کی تعداد محض چالیس ہزار تھی، جبکہ ان کے مقابلے میں رومی دو لاکھ چالیس ہزار تھے لیکن وہ بری طرح شکست کھائے۔ میدانِ جنگ سے واپسی کے بعد رومی بادشاہ حد درجہ مغموم حالت میں اپنے فوجیوں کی شکست کا راز دریافت کرتا ہے، اس نے اپنے فوجیوں سے کہا: ”تم برباد ہو، مجھے یہ بتاؤ کہ جو لوگ تم سے جنگ لڑ رہے تھے کیا وہ تمہاری طرح انسان نہ تھے؟“

انھوں نے جواب دیا: ”ضرور، کیوں نہیں۔“

بادشاہ کہتا ہے: ”یہ بتاؤ کہ تم زیادہ تھے یا وہ؟“

انھوں نے کہا: ”ہر مقام پر ہم ان سے کئی گنا زیادہ تھے۔“

بادشاہ پھر پوچھتا ہے: ”تب تم کیوں شکست کھاتے رہے؟“

رومیوں کے عظیم لوگوں میں سے ایک معمر شخص نے کہا: ”اس وجہ سے کہ وہ رات کو قیام کرتے ہیں (تہجد پڑھتے ہیں) دن کو روزہ رکھتے ہیں، عہد کو پورا کرتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں اور آپس میں انصاف کرتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارا حال یہ ہوتا ہے کہ ہم شراب پیتے ہیں، زنا کرتے ہیں، حرام کا ارتکاب کرتے ہیں، عہد شکنی کرتے ہیں، ظلم کرتے ہیں، ناپسندیدہ امور کا حکم دیتے ہیں اور جن باتوں سے اللہ راضی ہوتا ہے ان سے روکتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں۔“

بادشاہ بولا: ”تو نے مجھ سے سچ بات کہی۔“

(البدایہ والنہایہ لابن کثیر: ۷/۱۵-۱۶)

اس تجربہ کار رومی بزرگ نے عزت وذلت اور فتح وشکست کے بارے میں بالکل درست تجزیہ کیا تھا اور بتایا تھا کہ مسلمان تعداد میں بہت کم ہونے کے باوجود کثیر تعداد کے دشمنوں پر اس لیے فتح پاتے ہیں کہ ان کے عقائد واعمال درست ہیں، وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کا خیال رکھتے ہیں، اس لیے فتح وکامرانی ان کے قدم چومتی ہے اور زمین پر ان کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے۔ مسلمان اپنی تعداد سے نہیں بلکہ اپنے عمل اور کردار سے کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے: ”ہم زبور میں پند ونصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہی ہوں گے۔“ (سورہ انبیاء:۱۰۵) یہاں واضح کردیا گیا کہ اقتدار اور غلبہ و برتری صالحیت کے ساتھ مشروط ہے، تعداد اور طاقت کے ساتھ نہیں۔

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”جو لوگ بالکل کمزور شمار کیے جاتے تھے ہم نے ان کو اس سرزمین کے پورب وپچھم کا مالک بنادیا جس میں ہم نے برکت کر رکھی ہے اور آپ کے رب کا نیک وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پورا ہوگیا اور ہم نے فرعون کو اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں کو اور جو کچھ اونچی اونچی عمارتیں بنوائے تھے سب کو درہم برہم کر دیا۔“ (سورہ اعراف:۱۳۷)

صبر واستقامت، تقویٰ وصالحیت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اس جیسی نیکیاں نصرتِ الٰہی کے حصول کا سبب بنتی ہیں اور قلتِ تعداد کے باوجود مسلمانوں کو فتح وکامرانی کا تاج پہناتی ہیں۔ اس کے برعکس ہماری تعداد جتنی بھی زیادہ ہوجائے اگر یہ صفتیں اور یہ خوبیاں ہمارے اندر نہیں ہیں تو خس وخاشاک اور کوڑے کرکٹ سے زیادہ ہماری حیثیت نہ ہوگی۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ایسا وقت آنے والا ہے کہ دوسری امتیں تمہارے خلاف ایک دوسرے کو بلائیں گی جیسے کہ کھانے والے اپنے پیالے پر ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔ ایک شخص نے کہا کہ کیا یہ ان دنوں ہماری قلت تعداد کی وجہ سے ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا نہیں بلکہ تم ان دنوں بہت زیادہ ہوگے، لیکن تمہاری حیثیت سیلاب کے جھاگ کی طرح ہوگی۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے سینوں سے تمہاری ہیبت نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں ’وہن‘ ڈال دے گا۔ پوچھنے والے نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ’وہن‘ کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا: دنیا سے محبت اور موت سے نفرت۔“ (سنن ابوداؤد:۴۲۹۷)

ہر شخص جانتا ہے کہ اچھے لوگ کم ہی ہوتے ہیں چنانچہ مسلمان دوسروں کی بہ نسبت کم ہیں۔ پھر مسلمانوں میں حق اور سنت کی پیروی کرنے والے کم ہیں۔ نمازی کم ہیں، دین پسند کم ہیں، ایماندار کم ہیں۔ وطن عزیز کے اندر اگرچہ ہماری تعداد کم ہے لیکن ہم اپنے اخلاق وکردار سے برادرانِ وطن کا دل جیت سکتے ہیں۔ سچائی، ایمانداری، وعدہ وفائی، امانت داری، پڑوسیوں سے حسن سلوک، بے کسوں سے ہمدردی، کمزوروں کے ساتھ تعاون وغیرہ کے ساتھ بدسلوکی سے اجتناب، بے ایمانی، دھوکہ دھڑی، بدعہدی، امانت میں خیانت اور ان جیسے اعمالِ قبیحہ سے پرہیز کریں۔ اس سے لوگ ہمارے قریب آئیں گے اور ہمارے دین کے بارے میں اچھا تاثر قائم کریں گے۔

اسی طرح اقلیت میں ہوتے ہوئے ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم دوسروں کی بہ نسبت زیادہ محنت کریں بالخصوص تعلیمی میدان میں کیونکہ اس میدان میں اپنے قدم (باقی صفحہ ۱۴ پر)

ہم دوسروں کی بہ نسبت زیادہ محنت کریں بالخصوص تعلیمی میدان میں کیونکہ اس میدان میں اپنے قدم مضبوط کرکے ہم بہت کچھ حاصل کرسکتے ہیں۔ جبکہ زمینی حقیقت یہ ہے کہ تعلیم میں ہم دوسروں کے برابر ہونا تو دور کی بات ہے اس سے کافی پیچھے ہیں۔ اس سلسلے میں اسرائیل کو دیکھئے کہ یہودی پوری دنیا کی آبادی کا شاید ایک فیصد بھی نہیں ہیں، لیکن تعلیم اور محنت کے بل بوتے پر وہ پوری دنیا کی سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی رہنمائی انجام دے رہے ہیں۔

جشنِ جمہوریت پر ہمارا عہد

شاعر ملّت قاری محمد اسحاق حافظؔ سہارنپوری

اِک ایک داغ دل کا، فروزاں کریں گے ہم
یوں اہتمامِ جشنِ بہاراں کریں گے ہم

جوشِ عمل سے مشکلیں آساں کریں گے ہم
گردش کو اپنے تابعِ فرماں کریں گے ہم

رونے لگے تو حشر کا ساماں کریں گے ہم
پیدا اِک ایک اشک سے طوفاں کریں گے ہم

اِس طرز سے بہار کے ساماں کریں گے ہم
غنچے کو پھول، پھول کو خنداں کریں گے ہم

خونِ جگر سے سینچیں گے ہر گوشۂ چمن
ہر پھول میں بہار کا ساماں کریں گے ہم

دُنیا کا مال و زر تو کوئی چیز ہی نہیں!
اپنے وطن پہ جان بھی قرباں کریں گے ہم

مسلم کو ہندوؤں کی تمنّا بنائیں گے
ہندو کو آرزوئے مسلماں کریں گے ہم

وہ آ رہی ہے صحنِ گلستاں میں پھر بہار
پھر تار تار جیب وگریباں کریں گے ہم

جھونکے یہ کہہ رہے ہیں نسیمِ بہار کے
اِک ایک شاخ غنچہ بداماں کریں گے ہم

پیدا کریں گے اہلِ وطن میں ہم اتحاد
حافظؔ خلوص واُنس کا ساماں کریں گے ہم

عالمی خبریں

مسلمان ہونے کی وجہ سے امریکی صدارتی الیکشن میں تعصب کا نشانہ بنایا گیا

امریکہ میں انتخابات کے موقع پر صدارتی امیدوار ہیلری کلنٹن کے اسٹاف کی مسلم سربراہ ہما عابدین نے کہا ہے کہ ۲۰۱۶ء میں الیکشن کے دنوں میں بعض سیاست دانوں کی طرف سے مسلمانوں کو خوفناک کردار کے طور پر پیش کیا گیا۔ ڈیموکریٹک پارٹی کی امیدوار ہیلری کلنٹن ڈونلڈ ٹرمپ کے مقابلے میں شکست کا شکار ہوگئی تھیں۔ ہما عابدین نے عرب نیوز کو بتایا کہ انہوں نے ۲۰۱۲ء میں ریپبلکن پارٹی کے ایک عہدیدار کی جانب سے ان مطالبات کا بھی تحمل سے سامنا کیا جن میں کہا گیا تھا کہ تحقیقات کی جائیں کیونکہ وہ اور ان کے خاندان والے مسلمان ہیں جبکہ اس متعصّبانہ طرز عمل نے ۲۰۱۶ء کے انتخابات کے موقع پر بہت شدت اختیار کی۔ ہما عابدین کی حال ہی میں امریکی سیاست میں اپنے تجربے اور سعودی عرب میں اپنا بچپن گزارنے سے متعلق ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار عالمی پالیسی سازوں کے انٹرویوز کی سیریز ’فرینکلی سپیکنگ‘ میں کیا ہے۔ اس گفتگو کے دوران انہوں نے امریکی سیاست اور معاشرے میں بڑھتی ہوئی تقسیم، امریکی نظام میں خواتین کے اختیار اور نیو یارک کے سابق رکن کانگریس انتھونی ویز کے ساتھ اپنی شادی کے بارے میں بھی گفتگو کی ہے۔

چین میں شرح پیدائش میں ریکارڈ کمی سے معاشی نمو متاثر ہونیکا خدشہ

چین میں گزشتہ برس کم ترین شرح پیدائش کے اعداد وشمار سامنے آنے پر ماہرین نے متوقع سے زیادہ بڑھتی عمر کے افراد کی تعداد کے باعث معاشی بڑھوتری متاثر ہونے کے خدشات کا اظہار کیا ہے۔ خبر ایجنسی اے ایف پی کے مطابق پیر کو چین نے گزشتہ برس کے شرح پیدائش کے اعداد وشمار جاری کیے۔ چین کو نوجوان آبادی میں کمی کے بحران کا سامنا ہے جس کی وجہ سے بڑھتی عمر کے کارکنوں سے ملکی معیشت سست روی کا شکار ہو رہی ہے۔ چین میں کئی دہائیوں کے بعد شرح پیدائش میں ریکارڈ کمی دیکھی گئی ہے۔ چین کے نیشنل بیورو آف اسٹیٹسٹکس کے اعداد وشمار کے مطابق دنیا کی دوسری بڑی معیشت میں ہزار افراد میں شرح پیدائش گزشتہ برس کم ہو کر ساڑھے سات رہ گئی۔ ۲۰۲۰ میں یہ شرح ہزار افراد میں ساڑھے آٹھ تھی۔ بیورو کے مطابق یہ ۱۹۴۹ء میں کمیونسٹ چین کی بنیاد رکھے جانے کے بعد سب سے کم شرح پیدائش ہے۔ چین ۱۹۷۸ء کے بعد ملکی معیشت کے سالانہ اعداد وشمار کا تخمینہ جاری کرتا ہے جس کے مطابق بھی یہ کم ترین شرح ہے۔ چین میں حکومت نے دنیا کے سخت ترین فیملی پلاننگ ضوابط کو ۲۰۱۶ء میں نرم کر دیا تھا۔ حکام نے ایک بچہ پیدا کرنے کی قومی پالیسی کو نرم کرتے ہوئے جوڑوں کو دو بچے پیدا کرنے کی اجازت دی تھی اس کے باوجود شرح پیدائش کو بڑھانے میں کامیابی نہیں مل سکی۔ گزشتہ برس چین کی حکومت نے پالیسی کو مزید نرم کرتے ہوئے ایک خاندان کو تین بچے پیدا کرنے کی اجازت دی تھی۔ ۲۰۲۱ء میں چین میں دس کروڑ ۶۲ لاکھ بچے پیدا ہوئے جس سے ملکی آبادی ایک ارب ۴۱ کروڑ تک پہنچ گئی۔ پن پوسٹ اسیسمنٹ مینجمنٹ کے ژوی ژینگ نے اے ایف پی کو بتایا کہ آبادی کے بحران سے ہر ایک آگاہ ہے لیکن جس رفتار سے بڑی عمر کے افراد کی تعداد بڑھ رہی ہے وہ توقع سے زیادہ ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ چین کی متوقع معاشی نمو میں کمی ہوگی۔

جمہوری ہندستان میں ووٹ

ایک شرعی فریضہ بھی ہے اور ملی ضرورت بھی

تحریر: مولانا عبدالقوی ذکی حسامی

اس وقت ملک کے بعض ریاستوں میں انتخابی کروائی ہوئی ہے، اور ہونے والی بھی ہے، ایسے موقعوں پر ملک کے ہر باشندے کو بحیثیت شہری رائے دہی کا حق حاصل ہے، اگر مسلمان ہو تو اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، اس سلسلہ میں کسل پسندی، لاپرواہی یا ووٹ کا نہ استعمال کرنا ملک وقوم کے حق میں ناانصافی ہے، اور شریعت کی نگاہ میں جرم عظیم ہے، نہ صرف یہ کہ ووٹ کا صحیح استعمال بھی از حد ضروری ہے، ہم سب کو بالخصوص امت مسلمہ کو ووٹ ڈالنا اور صحیح فرد کو ڈالنا بہرصورت واجب الامر ہے، چونکہ ووٹ کا صحیح استعمال صحیح امیدوار کے انتخاب میں کلیدی اور بنیادی کردار ادا کرتا ہے، ووٹ کے غلط اور صحیح استعمال کی صورت میں نتائج بھی مثبت ومنفی آتے ہیں، جسکا سامنا ہر فرد کو کرنا پڑتا ہے، لہٰذا اس بات کو یقینی بنانے کے لئے ایسے امیدوار کا انتخاب ہو جو ملک وقوم کے حق میں مفید رساں ہو اور یہ ممکن ہے ووٹ کے صحیح استعمال پر، سب سے اول امیدوار میں دیانتداری اور کام کی اہلیت کا ہونا ضروری ہے، اور یہی وہ دو چیزیں ہیں جسکو حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کے سامنے ملک وقوم کی سلامتی غرض سے رکھی ہے، قال اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم (یوسف) اور اپنے آپ کو پیش کیا، انہیں دو خوبیاں کا ہر امیدوار میں ہونا ضروری ہے، اور اسی اساس پر ہمارا انتخاب بھی ہو، بصورت دیگر کام کی نااہلی اور قومی خزانے میں بدیانتی شر وفساد اور قتل وقتال کا ماحول پیدا کرتا ہے، جو نااہل کو ووٹ ڈالنے کی صورت میں ہوتا ہے، اس لحاظ سے ووٹ ڈالنا ایک شرعی فریضہ اور ملی ضرورت ہے۔ علماء نے ووٹ کی مختلف حیثیتیں لکھی ہیں۔

شہادت: سب سے پہلی چیز گواہی ہے، ووٹ دہندہ امیدوار کے حق میں گواہی دے رہا ہے کہ وہ اس کام کے لائق ہے، اور گواہی اسی سے لی جاتی ہے جو عاقل بالغ ہو، نیز گواہی دینے میں یہ بات ضروری ہے کہ گواہی صحیح صورتِ حال سے واقفیت کی بنیاد پر ہو، جھوٹ کا سہارا نہ لے، نبیؐ نے جھوٹی گواہی کو اکبرالکبائر فرمایا ان من اکبر الکبائر...... الخ وشهادة الزور، اور ایک موقع پر جھوٹی گواہی کو شرک کے ہم پلہ بتلایا ہے، اور یہ آیت تلاوت فرمائی فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور، اس رُو سے ہر ووٹ کا درست استعمال کرنا معلوم ہوتا ہے۔

شفاعت: دوسری چیز امیدوار کی حیثیت سفارشی کی سی ہے، جو پوری قوم کیطرف سے قوم کے مسائل کی ایوان بالا میں سفارش کرتا ہے، اب جو آدمی بھی اپنے مقام سے اس کو منتخب کر کے بھیجتا ہے گویا وہ بھی اس کے ہر کام میں معناً شریک کار ہے، اور اچھی سفارش کرے گا اس کا ثواب ووٹر کو بھی ملے گا، قرآن مجید میں ارشاد باری ہے من یشفع شفاعة حسنة یکن له نصیب منها اور اگر کوئی بری سفارش کرے تو اس کا وبال بھی اسی ووٹر کے بھی سر آئیگا ومن یشفع شفاعة سیئة یکن له کفل منها، مفتی شفیع صاحبؒ نے لکھا ہے کہ اچھی سفارش کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ووٹ کے ذریعہ قابل اور کام کی اہلیت والے امیدوار کا انتخاب کرے، اور بری سفارش کا معنی یہ کہ نااہل، نالائق، ظالم کی سفارش اپنے ووٹ کو ذریعہ سے کرے (معارف القرآن ۲/۴۹۸) لہٰذا معلوم ہوا جو آدمی ملک وقوم کے حق میں خیر خواہ ہو اسی کو چنے۔

وکالت: تیسری چیز جو امیدوار میں ہوتی ہے وہ ہے قوم کی وکالت، اگر کوئی آدمی اپنے ذاتی اور نجی معاملہ میں کسی کو اپنے کام کا وکیل اور نمائندہ بناتا ہے تو دو باتیں دیکھتا ہے اول یہ کہ اس میں کام کی اہلیت ہے یا نہیں، دوم یہ کہ ہے اس کام سے دلچسپی ہے یا نہیں، اسی بات کو صاحبِ ہدایہ وقدوری نے وکالت کی شرط میں لکھی ہے ویشرط ان یکون الوکیل ممن یعقل العقد ویقصده (ہدایہ بحوالہ نفائس الفقہ) مفتی کفایت اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں جب مسلمانوں کے ووٹ سے کوئی سیاسی مجلس وجود میں آتی ہو تو ایسے امیدوار کو ووٹ ڈالنا چاہئے جو اس کام میں ماہر اور اہل ہو۔ (کفایت المفتی ج ۹) جب ذاتی معاملہ میں اس قدر چھان بین ہو تو ملک وملت کے کام میں بدرجہ اولیٰ اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، ذات کا نفع ونقصان محدود اور ملک وملت کا نفع ونقصان لامتناہی ہوتا ہے، اس لئے جس امیدوار کو بھی منتخب کرے جانچ لے، آیا وہ ملک وملت کے حق میں کیا ارادے وعزائم رکھتا ہے۔

امیدوار کی ایک اور حیثیت: ایک چوتھی حیثیت امیدوار کی تعاون وتناصر کی ہے رائے دہندہ اپنے ووٹ کے ذریعہ اپنے بھائی کی ایک بڑے کام میں مدد کر رہا ہے، لہٰذا ووٹ ڈالنے سے قبل اس بات کو دیکھ لے کہ کیسے شخص کی مدد کر رہا ہے، اگر کوئی شخص اپنے کسی بھائی کی مدد کسی اچھے کام میں کرتا ہو اور اسمیں کسی درجہ بھی شریک ہو تو اس کا ثواب بھی ہر ایک کے برابر کا ملیگا، اور اس بات کی ترغیب دی گئی ہے ارشاد ربانی ہے وتعاونوا علی البر والتقوی اور اگر کوئی برے ارادے اور فسادِ نیت کے ساتھ ہمارے ووٹ کے ذریعہ برسر اقتدار آئے تو ایک معنی میں ہم نے انکو مدد فراہم کی جس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان، علامہ ذہبیؒ نے حضرت مکحولؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ قیامت کے دن ندا دی جائیگی کہ ظالم اور ان کے مددگار کہاں ہے؟ پس جس نے لکھنے سیاہی پیش کی ہوگی یا دوات میں سیاہی ڈالی ہوگی یا قلم چھیل کر دیا ہوگا یا ایسا کام کیا ہوگا جس سے ظلم پر اعانت ہوتی ہے ان سب کو جمع کیا جائیگا اور آگ کے بنائے ہوئے تابوت میں رکھ کر جہنم میں ڈالدیا جائے گا۔ (الکبائر للذھبی/ نفائس الفقہ)

ووٹ ڈالنے کا شرعی حکم: سطورِ بالا سے معلوم ہوگیا کہ ووٹ کی ایک حیثیت شہادت کی بھی ہے، چنانچہ گواہی کے متعلق قرآن مجید میں کیا حکم کیا گیا؟ اس سلسلہ میں حکم یہ کہ جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام ہے اس طرح سچی گواہی دینا بھی واجب ہی نہیں بلکہ حکم ربانی ہے واقیموا الشهادة لله اللہ کے واسطے گواہی قائم کرو ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوا کونوا قوامین لله شهداء بالقسط (المائدہ) کہ اللہ کے لئے انصاف وحق کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ بہت سوں میں یہ خیال گرد کرتا ہے کہ ہم ووٹ نہ ڈالیں گے تو کیا نقصان ہوگا، رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا من اُذِیَ عنده مومن فلم ینصره وهو یقدر علی ان ینصره ذله الله علی رئوس الخلائق جس شخص کے سامنے کسی مومن کو ذلیل کیا جا رہا ہو وہ اس کی مدد کرنے پر قادر ہو اور وہ نہ کرے تو اللہ قیامت کے دن اسے رسوا کرے گا۔

ووٹ نہ ڈالنا شرعاً جرم ہے: اسی طرح سچی گواہی کو چھپانے کی بھی قرآن میں سخت مذمت کی گئی ہے ولا تکتموا الشهادة ومن یکتمها فانه آثم قلبه، گواہی کو مت چھپاؤ جو شخص اس کو چھپائے اسکا دل گنہگار ہے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ وکتم شهادة اذا دُعی الیها کان کمن شهد بالزور (جمع الوائد) جس کسی کو گواہی (ووٹ) کے لئے بلایا جائے اور وہ نہ آئے تو گویا جھوٹی گواہی دے رہا ہے، ان آیات وروایات سے پتہ چلا کہ ووٹ ڈالنا شرعی نقطۂ نظر سے کتنا ضروری ہے، اگر ہم ووٹ ڈالنے میں کسی قسم کی بہانہ بازی کریں گے تو آخرت میں جواب دہ ہوں گے۔ اسلام کی نظر میں گواہی (ووٹ) ایک بہترین عمل بتلایا ہے حضورؐ نے فرمایا الا اخبرکم بخیر الشهداء الذی یاتی بشهادته قبل ان یسئلها (جمع الفوائد) نبیؐ نے فرمایا کیا میں تمھیں بہترین گواہ کون ہے نہ بتاوں؟ وہ شخص ہے جو اپنی گواہی کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ادا کر دے۔□□

وہ بھی کیا جمہوریت!

محمودؔ بھولے پوری

دام ہر شے کا گراں ہو جیب میں پائی نہ ہو
زندگی کا اتنا اسٹینڈرڈ تو ہائی نہ ہو!
کیسا، سوشل ازم، جو لائے نہ ایسی مفلسی
وہ بھی کیا جمہوریت جب اتنی مہنگائی نہیں
کوئی دفتر، کاریالیہ، محکمہ ایسا نہیں
جس میں رشوت اور غبن کی کارفرمائی نہیں
صرف تنخواہوں کے بل پر کیسے گزرے زندگی
کیا کریں بے چارے، آمدنی جو بالائی نہ ہو
ووٹ لینا تھا تو کل جھک جھک کے کرتے تھے سلام
اور اب ملتے ہیں یوں جیسے شناسائی نہ ہو
کیسے ممکن ہے کریں پھولوں کے دامن تار تار
جب تلک کانٹوں کی اتنی ہمت افزائی نہ ہو
ملک و ملت کی تباہی کے لیے سرکار نے
کونسی تدبیر ایسی ہے جو اپنائی نہ ہو

بچوں کا گوشہ

بچوں کی صحیح دینی و اخلاقی تربیت اور اصلاح نہایت ضروری (۱)

اولاد انسان کے لئے متاع عزیز ہے اس سے قیمتی دنیا کی کوئی دوسری چیز نہیں ہوسکتی، فی زمانہ بچوں کی صحیح تربیت کا مسئلہ والدین کیلئے بڑا نازک ہوتا جارہا ہے، بلکہ ایک چیلنج ثابت ہورہا ہے۔ محسن انسانیت، مربی اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی باب تربیت میں جو تعلیمات ہیں وہ تمام کیلئے مشعل راہ ہیں، طریق نبویؐ کے مطابق جو تربیت کی جائے گی انشاء اللہ وہ باعث خیر وبرکت ہوگی اور اس کے نمایاں اثرات بھی ہوں گے۔ ماں کی گود بچہ کی پہلی درسگاہ ہوتی ہے، ماں سے بچہ کو جو تربیت ملتی ہے وہ بنیادی حیثیت کی ہوتی ہے۔ بچپن سے ہی توحید کی بنیاد پر بچہ کی ذہن سازی کی جائے اور اس کا یقین اللہ کی ذات پر پختہ کرادیا جائے تو اس کے اثرات ساری عمر نمایاں رہیں گے، اس سے بچوں کے اندر غیرت اور خودداری آجاتی ہے اور بچپن میں بنا ہوا یقین دل میں پختگی کے ساتھ جم جاتا ہے۔ بچپن میں بچہ کا دل صاف شفاف آئینہ کی طرح ہوتا ہے۔ پھر جیسے ماحول میں بچہ کی نشو ونما ہوتی ہے ایسے ہی اثرات اس کے دل ودماغ پر نقش ہوتے جاتے ہیں اور عام طور سے اسی پر اس کی آئندہ زندگی کی تعمیر ہوتی ہے لہٰذا والدین اور اساتذہ کے لئے ضروری ہے کہ بچہ کی اخلاقیات پر بھی خاص توجہ دی جائے اور وہ بچہ کے لئے خوشگوار ماحول مہیا کریں۔ دین اسلام نے بچوں کی صحیح معنی میں دینی تربیت کے لیے رہنما اصول بیان کیے ہیں۔ ولادت کے بعد بچے کی تربیت کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر تربیتی حصہ سات سالوں پر مشتمل ہے۔ پہلے سات سال بچے کے کھیل کود کے سال ہیں جس میں اس کا کام کھانا پینا اور کھیل کود میں مشغول رہنا ہے۔ جو بچہ ابتدائی سات سال میں خوب کھیل کود کرتا ہے اس کے اندر کھیل کود کا مادہ پورا ہو جاتا ہے اور اگلے سات سالوں میں رغبت کے ساتھ تعلیم وتربیت کے مراحل طے کرتا ہے۔ پہلے سات سال کھیل کود کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بچے کو اچھے برے کی تمیز نہ دی جائے، کھیل کود کے ساتھ ساتھ بچوں کی دینی تربیت کرنا ضروری ہے۔ سات سال سے چودہ سال تک بچے کی تربیت کے سال ہیں جس میں بچے کو بنیادی عقائد ونظریات کی تعلیم دی جاتی ہے، اس کو آداب واخلاق سکھائے جاتے ہیں، اس کو اطاعت اور فرمانبرداری کے طریقے سکھائے جاتے ہیں اور بُری صفات کے ترک کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

تہوار

محمد حسین ندیم مرادآبادی

آگئی پھر جنوری دل کیف سے سرشار ہے
جھومتی ہے شاخِ گل پھولا پھلا گلزار ہے
وجد میں آئی ہوئی دُنیائے لالہ زار ہے
جس طرف دیکھو نشاط وکیف کا اظہار ہے
یہ ہمارے ملک کا سب سے بڑا تہوار ہے

رنگ آگیں قمقمے روشن ہیں یوں بالائے بام
آسماں پر جیسے تارے جھلملاتے ہوں تمام
کوچہ وبازار کیا گھر گھر مچی ہے دھوم دھام
ذرّہ ذرّہ زندگی کا مطلعِ انوار ہے
یہ ہمارے ملک کا سب سے بڑا تہوار ہے

آج کا دن ہے ہماری فتح اور نصرت کا دن
عالمِ اسباب میں رنگینیِ عشرت کا دن
رُوحِ آزادی سے ظاہر ہے کہ ہے عظمت کا دن
بربطِ فطرت کا اِک اِک تار نغمہ بار ہے
یہ ہمارے ملک کا سب سے بڑا تہوار ہے

سرزمینِ ملک کی عزت بڑھانا ہے ہمیں
ہر قدم راہِ ترقی پر اُٹھانا ہے ہمیں
زندگی کو کامیاب اپنی بنانا ہے ہمیں
آج کا دن نورِ آزادی سے جلوہ بار ہے
یہ ہمارے ملک کا سب سے بڑا تہوار ہے

گوشۂ خواتین

مسلم لڑکیوں کی دینی تربیت کا فقدان مضر اثرات اور حل (۱)

اس وقت ہندستان جس پرخطر دور سے گزر رہا ہے اس سے ہر باشعور شخص بخوبی واقف ہے، ہمارا ملک ہندوتوا کے جس ایجنڈے پر عمل پیرا ہے وہ کسی چشم بینا سے مخفی نہیں، منظّم انداز میں مسلم بچیوں کے ذریعہ اسلامی تہذیب پر شب خون مارنے کی زبردست کوشش ہورہی ہے، بلکہ کوشش کامیاب ہوچکی ہے، اس کے لیے مختلف تنظیمیں سرگرم عمل ہیں اور پیسے اور دیگر وسائل کا بھرپور استعمال کیا جارہا ہے، مسلم لڑکیوں کو ارتداد کی ناپاک چادر پہنانے کے لیے غیرمسلم لڑکوں کو باضابطہ تیار کیا جارہا ہے، اس کے لیے 'لوجہاد' کا جھوٹا پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا ہے بالآخر جو کوششیں ہورہی تھیں اس کے بھیانک نتائج سامنے آنے لگے ہیں اور جب پانی سر سے اونچا ہوگیا تو ہمارے مذہبی حلقوں سے اس پر مذمتی بیانات اور تحریریں آنی شروع ہوگئیں لیکن اب تک جو کچھ بھی اس کے دفاع میں کیا جارہا ہے، میرے خیال سے 'مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' کے مصداق ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے مرض کی تشخیص ضروری ہے کہ بیماری کیا ہے؟ اور بیماری کہاں سے پیدا ہورہی ہے اور اس کا حل کیا ہے؟ اگر اس پہلو پر سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی تو جلسے جلوس، مسجد کے ممبر سے وعظ ونصیحت کی کثرت اور تحریروں کا یہ سیلاب اس بھیانک سیلاب کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ سب سے پہلے اس کا جائزہ لیجیے کہ یہ بیماری کہاں سے آرہی ہے؟ مسلم بچیاں غیرمسلم کے دام فریب میں کس طرح آرہی ہیں؟ وہ کون سے طریقے اور راستے ہیں جہاں سے مسلم لڑکیاں غیرمسلموں کی دوست بن رہی ہیں اور پھر یہ دوستی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ کوئی طاقت ان کو گمراہی کے راستے پر جانے سے نہیں روک سکتی ہے۔ آخر کون سا نشہ انھیں پلا دیا جاتا ہے کہ ماں کی ممتا اور باپ کی محبت، خاندان کی چہاردیواری، بھائی بہنوں کی محبت کی ڈوری، اسلامی تہذیب کی توانائی سب کچھ انھیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں اور عارضی محبت کے اس نشے میں وہ سب کچھ قربان کر کے اسلام کے اس حصار کو پار کر جاتی ہیں جس کے ذریعہ وہ نہ صرف اپنا خاندان، ماں باپ، بھائی بہن، رشتے دار سے دور ہوجاتی ہیں، بلکہ ہمیشہ ہمیش کے لیے جنت کے دروازے کو اپنے اوپر بند کرلیتی ہیں اور جہنم کی مستحق بن جاتی ہیں۔

صفحہ تحفظ ختم نبوت

قادیانی مسائل: سوال وجواب کی روشنی میں ۶

تحریر: مولانا ابوعمار محمد عبدالحلیم اطہر سہروردی

حضرت مہدی رضی اللہ عنہ کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے اور جس پر اہل حق کا اتفاق ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی نسل سے ہوں گے اور نجیب الطرفین سیّد ہوں گے، ان کا نام نامی محمد اور والد کا نام عبداللہ ہوگا۔ جس طرح صورت وسیرت میں بیٹا باپ کے مشابہ ہوتا ہے اسی طرح وہ شکل وشباہت اور اخلاق وشمائل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہوں گے۔ وہ نبی نہیں ہوں گے نہ ان پر وحی نازل ہوگی، نہ وہ نبوت کا دعویٰ کریں گے، نہ ان پر بحیثیت نبی کے کوئی ایمان لائے گا۔ ان کی کفار سے خونریز جنگیں ہوں گی۔ ان کے زمانے میں کانے دجال کا خروج ہوگا اور وہ لشکرِ دجال کے محاصرے میں گھر جائیں گے۔ ٹھیک نمازِ فجر کے وقت دجال کو قتل کرنے کے لیے سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے اور فجر کی نماز حضرت مہدی رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں پڑھیں گے، نماز کے بعد دجال کا رُخ کریں گے۔ وہ لعین بھاگ کھڑا ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کا تعاقب کریں گے اور اسے باب لد پر قتل کردیں گے۔ دجال کا لشکر تہہ تیغ ہوگا اور یہودیت ونصرانیت کا ایک ایک نشان مٹا دیا جائے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نشانیاں

سوال: قادیانی کہتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں جبکہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ آسمان پر زندہ ہیں اور قربِ قیامت میں دوبارہ تشریف لائیں گے۔ براہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بارے میں ارشاد فرمائیں، مزید برآں مسلمان انھیں کس طرح پہچانیں گے اور ان کی کیا کیا نشانیاں ہیں؟

جواب: قرآن کریم اور احادیث طیبہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کو قیامت کی بڑی نشانیوں میں شمار کیا گیا ہے اور قیامت سے ذرا پہلے ان کے تشریف لانے کی خبر دی ہے لیکن جس طرح قیامت کا وقت معین نہیں بتایا گیا کہ فلاں صدی میں آئے گی اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا وقت بھی معین نہیں کیا گیا کہ وہ فلاں صدی میں تشریف لائیں گے۔ قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ''اور بے شک وہ نشانی ہے قیامت کی۔ پس تم اس میں ذرا بھی شک مت کرو۔'' (سورہ زخرف) بہت سے اکابر صحابہ وتابعین نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا قرب قیامت کی نشانی ہے، قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں ہے: ''اور نہیں کوئی اہل کتاب میں سے مگر ضرور ایمان لائے گا اس پر اس کی موت سے پہلے اور قیامت کے دن وہ ہوگا ان پر گواہ۔'' (النساء)

حدیث شریف میں ہے: ''اور میں سب لوگوں سے زیادہ قریب ہوں عیسیٰ بن مریم کے کیونکہ میرے اور اس کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا۔ پس جب تم اس کو دیکھو تو اس کو پہچان لینا، قد میانہ، رنگ سرخ وسفید، بال سیدھے، بوقت نزول ان کے سر سے گویا قطرے ٹپک رہے ہوں گے، خواہ ان کو تری نہ بھی پہنچی ہو، ہلکے رنگ کی دو زرد چادریں زیب تن ہوں گی۔ پس صلیب کو توڑ ڈالیں گے خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ کو بند کریں گے اور تمام مذاہب کو معطل کردیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسلام کے سوا تمام ملتوں کو ہلاک کردیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے زمانے میں مسیح دجال کذاب کو ہلاک کردیں گے۔ زمین میں امن وامان کا دور دورہ ہوجائے گا یہاں تک کہ اونٹ شیروں کے ساتھ، چیتے گائے کے ساتھ اور بھیڑیے بکریوں کے ساتھ چریں گے اور بچے سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ پس جتنا عرصہ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا زمین پر رہیں گے پھر ان کی وفات ہوگی پس مسلمان ان کی نماز جنازہ پڑھیں گے اور انھیں دفن کریں گے۔'' (مسند احمد ص ۴۳۷، جلد۲، فتح الباری، ص ۴۹۳، جلد۶، مطبوعہ لاہور، التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ص ۱۶۱)

عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے جو واقعات احادیث طیبہ میں ذکر کی گئے ہیں ان کی فہرست خاصی ہے، مختصراً:

- آپ سے پہلے حضرت مہدی کا آنا۔
- آپ کا عین نمازِ فجر کے وقت اُترنا۔
- حضرت مہدی کا آپ کو نماز کے لیے آگے کرنا اور آپ کا انکار فرمانا۔
- نماز میں آپ کا قنوتِ نازلہ کے طور پر یہ دعا پڑھنا وقتل اللہ الدجالؔ (اللہ تعالیٰ نے دجال کو قتل کردے)
- نماز سے فارغ ہوکر آپ کا قتل دجال کے لئے نکلنا۔
- دجال کا آپ کو دیکھ کر سیسے کی طرح پگھلنے لگنا۔
- 'باب لدؔ' پر آپ کا دجال کو قتل کرنا اور اپنے نیزے پر لگا ہوا دجال کا خون مسلمانوں کو دکھانا۔
- قتل دجال کے بعد تمام دنیا کا مسلمان ہوجانا، صلیب کے توڑنے اور خنزیر کو قتل کرنے کا عام حکم دینا۔
- آپ کے زمانہ میں امن وامان کا یہاں تک پھیل جانا کہ بھیڑیے بکریوں کے ساتھ اور چیتے گائے بیلوں کے ساتھ چرنے لگیں اور بچے سانپوں کے ساتھ کھیلنے لگیں۔
- کچھ عرصہ بعد یاجوج ماجوج کا نکلنا اور چارسو فساد پھیلانا۔
- ان دنوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنے رفقاء سمیت کوہِ طور پر تشریف لے جانا اور وہاں خوراک کی تنگی کا پیش آنا۔
- بالآخر آپ کی بددعا سے یاجوج ماجوج کا یکدم ہلاک ہوجانا اور بڑے بڑے پرندوں کا ان کی لاشوں کو اُٹھا کر سمندر میں پھینکنا اور پھر زور کی بارش ہونا اور یاجوج ماجوج کے بقیہ اجسام اور تعفن کو بہا کر سمندر میں ڈال دینا۔
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا عرب کے ایک قبیلہ بنوکلب میں نکاح کرنا اور اس سے آپ کی اولاد ہونا۔
- 'فج الروحا' نامی جگہ پہنچ کر حج وعمرہ کا احرام باندھنا۔
- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر پر حاضری دینا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ اطہر کے اندر سے جواب دینا۔
- وفات کے بعد روضہ اطہر میں آپ کا دفن ہونا۔
- آپ کے بعد مقعد نامی شخص کو آپ کے حکم سے خلیفہ بنایا جانا اور مقعد کی وفات کے بعد قرآن کریم کا سینوں اور صحیفوں سے اُٹھ جانا۔
- اس کے بعد آفتاب کا مغرب سے نکلنا نیز دابۃ الارض کا نکلنا اور مومن وکافر کے درمیان امتیازی نشان لگانا وغیرہ وغیرہ۔

کیا حضرت مہدی و عیسیٰ علیہ السلام ایک ھی ھیں؟

سوال: مہدی اس دنیا میں کب تشریف لائیں گے؟ اور کیا مہدی اور عیسیٰ ایک ہی وجود ہیں؟

جواب: حضرت مہدی رضوان اللہ علیہ آخری زمانہ میں قرب قیامت میں ظاہر ہوں گے، ان کے ظہور کے تقریباً سات سال بعد دجال نکلے گا اور اس کو قتل کرنے کے لیے عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر تیرہویں صدی کے آخر تک امت اسلامیہ کا یہی عقیدہ رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدی دو الگ الگ شخصیتیں ہیں اور یہ کہ نازل ہوکر پہلی نماز حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت مہدی کی اقتدا میں پڑھیں گے۔ مرزا غلام احمد قادیانی پہلے شخص ہیں جنھوں نے عیسیٰ اور مہدی کے ایک ہونے کا عقیدہ ایجاد کیا ہے اس کی دلیل نہ قرآن کریم میں ہے نہ کسی صحیح اور مقبول حدیث میں اور نہ سلف صالحین میں کوئی اس کا قائل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر احادیث میں وارد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت حضرت مہدی اس امت کے امام ہوں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کی اقتدا میں نماز پڑھیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بحیثیت نبی کے تشریف لائیں گے یا بحیثیت امتی کے

سوال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے۔ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے۔ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام بحیثیت نبی تشریف لائیں گے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کی حیثیت سے؟ اگر آپ بحیثیت نبی تشریف لائیں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النّبیین کیسے ہوئے؟

جواب: حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب تشریف لائیں گے تو بدستور نبی ہوں گے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے ان کی شریعت منسوخ ہوگئی اور ان کی نبوت کا دور ختم ہوگیا اس لیے جب وہ تشریف لائیں گے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی پیروی کریں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی کی حیثیت سے آئیں گے۔ ان کی تشریف آوری ختم نبوت کے خلاف نہیں کیونکہ نبی آخرالزماں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مل چکی تھی۔ ◻◻

ھمیں ھے جان سے پیارا نشان ختمِ نبوت کا

علامہ ڈاکٹر محمد اشرف آصفؔ جلالی

ہمیں ہے جان سے پیارا نشاں ختمِ نبوت کا
اٹھو گھر گھر میں پہنچا دو بیاں ختمِ نبوت کا
ملائک کی جماعت روز وشب واں پہ اترتی ہیں
ذکر جاری ہمیشہ ہے جہاں ختمِ نبوت کا
تھے جتنے بھی نبی دیگر نبوت ان کی وقتی تھی
مگر ہے حشر تک سارا زماں ختمِ نبوت کا
یہ نعرہ ہے امیر المومنیں صدیق اکبر کا
کرو اپنے لہو سے بھی دھیاں ختمِ نبوت کا
مٹا دو زورِ بازو سے کفر ہر قادیانی کا
یمامہ سے اٹھا لو ہر سناں ختمِ نبوت کا
انوکھی شان اس فن میں کیا مہر علی کی ہے
کیا جس نے عقیدے سے بیاں ختمِ نبوت کا
الٰہی شاہ نورانی کی قبر پہ رحمتیں برسیں
بنایا جس نے پورا کارواں ختمِ نبوت کا
سنو جتنے بھی یاں ختم نبوت کے فدائی ہو
رہے یہ قافلہ ہر دم رواں ختمِ نبوت کا
دبانے کو زمانے میں گلا ہر قادیانی کا
لگائے نعرہ ہر پیرو جواں ختمِ نبوت کا
خداوندا مدینے کے چمکتے چاند کا صدقہ
بنا دے اپنے آصف کو حساں ختمِ نبوت کا

جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ کی
حیات وخدمات پر مشتمل
ہفت روزہ الجمعیۃ دھلی کی خصوصی اشاعت
مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ نمبر
اپنی تمام تر خوبیوں، بہترین مضامین، شاندار طباعت اور دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ منظر عام پر آچکا ھے۔
صفحات ۱۹۶ | سائز: ۲۳×۳۶/۸ | قیمت -/150
رابطہ: ہفت روزہ الجمعیۃ، مدنی ہال (بیسمینٹ) ۱، بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی ۲
موبائل: 09868676489

ہفت روزہ الجمعیۃ نئی دہلی کی
خصوصی پیشکش
تحفظ ختم نبوت نمبر
انشاء اللہ العزیز انتہائی آب وتاب کے ساتھ بہت جلد منظر عام پر آرہا ہے
مکمل تفصیلات آئندہ ملاحظہ فرمائیں
رابطہ: ہفت روزہ الجمعیۃ، مدنی ہال (بیسمینٹ) ۱، بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی ۲
موبائل: 09868676489 — ای میل: aljamiatweekly@gmail.com

ہندستان میں ہچکولے کھاتی جمہوریت

ملک کے مستقبل کیلئے لمحۂ فکریہ

معروف صحافی جناب **عبدالماجد نظامی** کا ایک تجزیاتی مضمون

معروف سماجی کارکن ہرش مندر نے گزشتہ ہفتہ انگریزی روزنامہ 'انڈین ایکسپریس' میں اپنا ایک وقیع مضمون شائع کیا جس میں انھوں نے قارئین کی توجہ اس جانب مبذول کرنے کی کوشش کی کہ ہندستان میں جمہوریت ڈگمگا رہی ہے اور ہچکولے کھا رہی ہے۔ وہ دراصل جمہوریت کے موضوع پر اس ورچوئل چوٹی کانفرنس کے حوالہ سے گفتگو کررہے تھے جس کا اہتمام امریکہ نے کیا تھا۔ انھوں نے امریکی صدر جو بائیڈن کی اس کوشش کو سراہا کہ ایسے وقت میں جبکہ دنیا کے اکثر ممالک میں جمہوریت کمزور ہورہی ہے، امریکی صدر کا یہ اقدام بالکل مناسب اور بروقت ہے۔ امریکی صدر نے استقبالیہ تقریر میں دنیا کی موجودہ حالت کو جمہوریت کی کساد بازاری سے تعبیر کیا تھا۔ جن جمہوری ملکوں کے لیڈران کو ورچوئل چوٹی کانفرنس میں جمہوریت کے مسئلہ پر سنجیدگی سے بات چیت کرنے اور جمہوری اصولوں کو مضبوط بنانے کی غرض سے دعوت دی گئی تھی خود ان میں سے کئی ممالک میں جمہوریت کی حالت کچھ بہتر نہیں ہے، یہاں تک کہ امریکہ کی جمہوریت بھی چیلنجز سے نبرد آزما ہے۔

جمہوریت کے لیے صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ بالغان کو رائے دہی کا حق حاصل ہوجائے۔ آزاد اور پرامن ماحول میں انتخابات کا عمل پایۂ تکمیل کو پہنچے اور عوام کی رائے کا احترام کرتے ہوئے شکست کھانے والی سیاسی پارٹی حکومت کی باگ ڈور اس پارٹی کے حوالہ کردے جس کو عوام کا اعتماد اور تائید حاصل ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک کامیاب جمہوریت کے لیے یہ نہایت اہم عناصر ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ اہم عنصر یہ ہے کہ جمہوریت کی ان ظاہری شکلوں کو ہی صرف کامیاب جمہوریت کے زمرہ میں رکھ کر مطمئن نہ ہوا جائے بلکہ صحیح معنی میں جمہوریت کو کامیاب تب مانا جائے گا جب عملی طور پر عوام کی زندگی پر اس کا مثبت اثر بھی مرتب ہونے لگے۔ ایسا تبھی ممکن ہو پائے گا جب ہم جمہوریت کو سخت معیاروں پر ناپنا شروع کریں گے۔ کسی بھی برسراقتدار سیاسی پارٹی کو جمہوری قدروں کے تئیں تبھی سنجیدہ مانا جائے گا جب سرکار ملک کی ہر اقلیت کے حقوق کو یکساں طور پر محفوظ رکھنے میں اپنی کوششیں ظاہر کرے۔ عوام کو اپنی بات آزادی سے کہنے کی اجازت ملے، اسٹیٹ کے عوام مخالف فیصلوں کے خلاف پرامن احتجاج کا موقع شہریوں کو نصیب ہو اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ عوام سے صحیح معنی میں مشورہ طلب کیا جائے اور ان کی رائے کا احترام ہوگا اور فیصلہ سازی کے تمام مراحل میں شفافیت کا خیال رکھا جائے گا۔ اگر کسی جمہوریت میں یہ تمام عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں تو اس کو ایک کامیاب جمہوریت کہلانے کا حق حاصل ہوگا۔

ہندستان کے وزیراعظم نریندر مودی جنھیں اس چوٹی کانفرنس میں دعوت دی گئی تھی انھوں نے اس بات پر زور دے کر کہا کہ ہر ہندستانی میں جمہوریت کی روح پیوست ہے، انھوں نے مزید کہا کہ ہندستانی معاشرہ تکثیریت، سماجی ہم آہنگی اور قانون کی بالادستی جیسے امور سے عبارت ہے لیکن کیا آج کے ہندستان میں پورے اعتماد سے بے خوف ہوکر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تمام عناصر ہمارے معاشرہ میں موجود ہیں؟ ہندستان میں بسنے والی اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے لیے شاید اس سے بدتر دور کبھی نہیں آیا ہوگا۔ مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیزی شب و روز جاری ہے اور اس پر کوئی روک تھام نہیں ہے۔ برسراقتدار پارٹی کے بعض لیڈران اور وزراء تک مسلم مخالف زہرافشانی میں ملوث ہیں۔ ان پر جملے کسے جاتے ہیں اور ان کی شبیہ مجروح کی جاتی ہے۔ ان کی جانیں اور ان کے اموال یہاں تک کہ ان کی عزت و آبرو تک محفوظ نہیں ہیں۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں کبھی افریقی نژاد امریکیوں کی لنچنگ ہوا کرتی تھی لیکن ہندستان میں وہی رویہ مسلمانوں اور دلتوں کے خلاف اکیسویں صدی میں اپنایا گیا۔ مسلمانوں کی شادی بیاہ کے رشتے، کھانے پینے کے عادات و اطوار، عبادت و رسومات، ہندستان میں ہندو مسلم مشترک تہذیب و تاریخ کی علامتیں گویا کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی جس کو نشانہ نہ بنایا گیا ہو۔ بیف کا بہانہ بنا کر مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو کمزور کرنے کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ وہیں تک محدود نہیں رہا بلکہ سبزی بیچنے والے مسلمان ٹھیلہ دار، ریستوراں کے مالکان یہاں تک کہ چوڑی اور کنگن فروخت کرنے والے بھی نشانہ بنائے گئے۔ سی اے اے کے ذریعہ انھیں شہری حقوق تک سے محروم کرنے کی راہ نکال لی گئی۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسری اقلیتیں مثلاً عیسائیوں کے عبادت خانوں اور ان کے مذہبی رہنماؤں کو بھی سخت حملوں کا شکار ہونا پڑا۔ عوام مخالف پالیسیوں کے خلاف جو لوگ آواز بلند کرتے ہیں انھیں اربن نکسل، ماؤوادی، جہادی اور خالصتانی کہہ کر خاموش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا پھر سیڈیشن یعنی بغاوت جیسے سخت قوانین کے تحت جیلوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ آج جو حالات ہیں وہ جمہوریت کی صحت کے لیے بالکل مفید نہیں ہیں۔ گاندھی جی کا خواب ان حالات کے برعکس تھا۔ ہرش مندر نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ شہادت سے کئی ہفتوں قبل گاندھی جی نے اپنے سپنوں کے جس ہندستان کا تصور پیش کیا تھا اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ میرے خوابوں کا ہندستان ایسا ہوگا جس میں ایک مسلمان بچہ بے خوف ہوکر چل سکے گا۔ عجیب اتفاق ہے کہ آج مسلم اقلیت سب سے زیادہ خوف میں جی رہی ہے۔ اگر ہندستان کو ایک کامیاب جمہوریت میں تبدیل کرنا ہے، جس میں کسی کے ساتھ بھید بھاؤ نہیں ہوگا اور نہ کسی کو اپنی شناخت چھپانے کی ضرورت ہوگی تو خوف کا ماحول ختم کرنا ہوگا اور انسانی حقوق کی حفاظت کرنی ہوگی۔ ◻◻

> **آج جو حالات ہیں وہ جہوریت کی صحت کے لیے بالکل مفید نہیں ہیں۔ گاندھی جی کا خواب ان حالات کے برعکس تھا۔ ہرش مندر نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ شہادت سے کئی ہفتوں قبل گاندھی جی نے اپنے سپنوں کے جس ہندستان کا تصور پیش کیا تھا اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ میرے خوابوں کا ہندستان ایسا ہوگا جس میں ایک مسلمان بچہ بے خوف ہوکر چل سکے گا۔ عجیب اتفاق ہے کہ آج مسلم اقلیت سب سے زیادہ خوف میں جی رہی ہے۔**

جمہوریت میں اقلیتوں کے حقوق کی اہمیت

تحریر
ابھے کمار

کیا اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں بولنے لکھنے سے سماج میں پھوٹ پڑتی ہے؟ کیا اقلیتوں کے حقوق کا مطالبہ کرنے کی بجائے عام شہریوں کے حقوق کی بات ہونی چاہیے؟ ایسے سوالات اکثر ہمارے سامنے آتے ہیں اور ایسا تاثر پھیلایا جاتا ہے گویا اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں بات کرنے سے ملک کمزور ہوجاتا ہے۔ بھگوا سیاسی جماعت لمبے وقت سے اقلیتوں کے حقوق کی بات کرنے والے لوگوں کو نشانہ بناتی رہی ہے۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کو مسلم نواز کہا اور ان کے سینے میں گولی تک داغ دی۔ کانگریس، بایاں محاذ اور سماجی انصاف کے نظریہ کی حامل پارٹیوں کے اوپر بھگوا جماعت مسلم منہ بھرائی کا الزام لگاتی رہی ہے۔ مسلم سیاسی اور ملّی جماعت کے بارے میں یہ غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ وہ چھوٹی سوچ میں مبتلا رہتے ہیں اور وہ ہندو سماج اور ملک کے مفاد کے خلاف کام کرتے ہیں۔ ان تمام اعتراضات کے برعکس سچائی یہ ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کے لیے لڑنے سے سماج اور ملک کمزور نہیں بلکہ مضبوط ہوتا ہے۔ اگر سماج میں کوئی طبقہ کسی بھی طرح سے بھید بھاؤ اور تعصب کا شکار ہو تو اس کو دور کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے بنیادی مسئلہ کی نشاندہی ہو اور اس پر کھل کر بات ہو۔ مرض کو چھپا لینے سے مرض دور نہیں ہوجاتا۔ محکوموں، محروموں اور مظلوموں کے خلاف ہورہے ظلم اور زیادتی کی بات کرنے کے بعد ہی انھیں ختم کرنے کے بارے میں منصوبہ بنایا جاسکتا ہے۔ اسی سیاق میں ہمیں اقلیتوں کے حقوق کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔

۱۸ ردسمبر ۱۹۹۲ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اقلیتوں کے حقوق سے متعلق ایک قرارداد کو اپنایا تھا اور اس کے بعد سے یہ دن یوم اقلیتی حقوق کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اسی دوران بھارت سرکار نے قومی نیشنل کمیشن کی تشکیل کی۔ بھارت میں مسلمان، عیسائی، سکھ، بودھسٹ، پارسی، جین کو مذہبی اقلیت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ قومی اقلیتی کمیشن کی طرح ہی ریاستی اقلیتی کمیشن کا کام آئین میں درج اقلیتوں کے حقوق کو تحفظ کرنا اور ان کی پامالی ہونے پر واجب کارروائی کرنا ہے، مگر افسوس کہ بات یہ ہے کہ اقلیتی کمیشن کی کرسی پر اکثر سیاسی لوگوں کو بیٹھا دیا جاتا ہے جن کے دلوں میں اپنی سیاسی جماعت کے مفاد کو پورا کرنا عوام کے مفاد سے کہیں زیادہ اہم ہوتا ہے۔ دوسری بڑی پریشانی یہ ہے کہ جو لوگ اقلیتی حقوق کو اکثریت کے خلاف تصور کرلیتے ہیں وہ نیشن اسٹیٹ یا قومی ریاست کی تاریخ کو سمجھتے نہیں یا پھر دانستہ طور پر سمجھنا نہیں چاہتے۔ دراصل نیشنل انگریزی کا ایک لفظ ہے جس کا مطلب ہوتا ہے ملک یا عوام۔ یہاں عوام سے مراد کسی مخصوص ملک میں رہنے والے لوگوں سے ہوتا ہے جن کی زبان، تاریخ، ثقافت، رسم و رواج ایک ہوتی ہے اور جنھیں مجموعی طور پر قوم کہا جاتا ہے۔ نیشن اسٹیٹ کا وجود جدید دور میں اس وقت سامنے آیا جب جدید ملک کی حدود ایک قوم کی آبادی کے تناسب میں کھینچا جانے لگا۔ پھر قومی ریاست کا وجود ایک آزاد ملک کے طور پر ہوا اور یہ مان لیا گیا کہ اس میں رہنے والے تمام لوگ جو ایک قوم کہلائے گئے، ایک ہی ثقافت، زبان، تاریخ وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ قوم کی جو اصطلاح بنائی گئی وہ دراصل تنقید سے پاک نہیں تھی کیونکہ دنیا میں کوئی بھی ایسا حصہ نہیں ہے جہاں ایک ہی زبان، تاریخ، ثقافت سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی زندگی گزر بسر کرتے ہیں۔ دراصل سماج تو ایک گلدستہ کی طرح پھولوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے جہاں تمام رنگ اور خوشبو کے پھول پائے جاتے ہیں۔ ہر سماج کا اصل چہرہ متنوع ہے اور اسے کسی ایک خاص مذہب، ذات، نسل سے جوڑنا ایک بیماری ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی قومی ریاست تشکیل دی گئی تو خون خرابہ ہوا اور کمزور ترین لوگوں کا حق مارا گیا۔ جب ایک ہی زبان، مذہب، ثقافت، تاریخ کی بنیاد پر قوم کی تعریف اور توضیح کی جائے گی، جو کبھی وجود میں تھی ہی نہیں تو دیگر زبان، دھرم کے ماننے والوں کو قوم سے باہر کردیا جائے گا۔ یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ دنیا کی تاریخ میں جہاں بھی قومی ریاست تشکیل دی گئی وہاں ایک خاص مذہب، زبان، ثقافت کے ماننے والے لوگوں کو قوم کا حصہ بنایا گیا اور باقی لوگوں کو اَن فٹ کہہ کر مین اسٹریم سے الگ تھلک کردیا گیا۔ تبھی تو قومی ریاست کی تاریخ اقلیتوں کی بدحالی کی بھی داستان ہے۔

> **جو بھگوا عناصر بھارت میں مسلمانوں کے لیے اقلیتی حقوق کی مخالفت کرتے ہیں وہ بھارت سے باہر ہندو اقلیت کے حقوق کے بڑے حامی ہیں۔ یکساں قانون ہر بار مساوات کو فروغ نہیں دیتا کیونکہ لوگوں کی ضرورت الگ الگ ہوتی ہے۔ بس یا ٹرین میں عورتوں کے لیے سیٹوں کو مختص کرنے سے مردوں کا حق نہیں مارا جاتا، بلکہ سماج میں کمزوروں کے ساتھ انصاف کیا جاتا ہے۔**

قومی ریاست کے وجود میں آتے ہی دنیا بھر میں کروڑوں لوگ، جو بہت سالوں سے ایک خاص ملک میں رہ رہے تھے۔ اچانک سے اقلیت بنا دیئے گئے اور ان کے لیے زندگی جینا دشوار کردیا گیا۔ متحدہ بھارت کی ہی مثال لے لیجیے، جہاں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، جین، بدھسٹ، پارسی، دلت، آدی واسی، دراوڑ وغیرہ ہزاروں سالوں سے زندگی جی رہے تھے مگر جب انگریز بھارت میں حکمراں بنے تب انھوں نے بھارت کی تاریخ لکھی اور بھارت کو فرقہ واریت کے لیے زمین تیار کردی۔ انگریزوں نے اس تعصب کو جنم دیا کہ قدیم بھارت کی تہذیب اور ثقافت ویدک یا ہندو رہی ہے جبکہ مسلمانوں کی بھارت میں آمد ایک حملہ آور کے طور پر ہوئی۔ ہندو اور مسلم فرقہ پرست نے انگریزوں کے فرقہ وارانہ تاریخ کے بعض حصوں کو اپنی سہولت کے مطابق اُدھار لے لیا۔ ہندو فرقہ پرست کو انگریزوں کی یہ بات پسند آئی کہ اصل ہندستان ہندو قوم پر مبنی ہے جبکہ مسلم فرقہ پرستی کو اس بات پر فخر محسوس ہوا کہ مسلمانوں نے ہندو قوم کو مغلوب کرکے ان پر راج کیا ہے اور اس طرح بھارت کے سارے مسلمانوں کے مفاد ہندوؤں کے خلاف ہیں اور ہندو قوم کی طرح مسلمان بھی ایک جدا قوم ہے۔ مسلم فرقہ پرستوں نے بڑی آسانی سے یہ بات فراموش کردی کہ مسلم حکمراں کی طرف سے لڑنے والا نہ صرف مسلم تھا بلکہ ہندو بھی تھا اور اسی طرح ہندو راجا کی طرف سے مسلمان بھی فوج میں شامل تھے۔ مسلمانوں میں امیری غریبی ہوتی ہے، ان میں ذات برادری ہوتی ہے، ان میں زمیندار اور کسان ہوتے ہیں ان سے مسلم فرقہ پرستوں کو کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہندو اور مسلم فرقہ پرست دو قومی نظریہ کے حامی بن گئے اور انھوں نے ملک کو تقسیم کی آگ میں دھکیل دیا۔ تقسیم ملک اور قومی ریاست کے ساتھ ہی ایک بڑی آبادی کو اقلیت بنا دیا گیا۔

یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کوئی اقلیت پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی اقلیت اپنی خوشی سے بننا چاہتا ہے۔ تاریخ نے دنیا کے کروڑوں لوگوں کو اقلیت بنا دیا اور ان کی زندگی مفلوج کردی۔ تضاد دیکھئے کہ جو بھگوا عناصر بھارت میں مسلمانوں کے لیے اقلیتی حقوق کی مخالفت کرتے ہیں وہ بھارت سے باہر ہندو اقلیت کے حقوق کے بڑے حامی ہیں۔ یکساں قانون ہر بار مساوات کو فروغ نہیں دیتا کیونکہ لوگوں کی ضرورت الگ الگ ہوتی ہے۔ بس یا ٹرین میں عورتوں کے لیے سیٹوں کو مختص کرنے سے مردوں کا حق نہیں مارا جاتا، بلکہ سماج میں کمزوروں کے ساتھ انصاف کیا جاتا ہے۔ بابا صاحب امبیڈکر اقلیتی حقوق کو جمہوریت کا اظہار حصہ مانتے تھے کیونکہ جمہوریت میں حکومت سازی اکثریت کے ووٹ سے کی جاتی ہے اور اعلیٰ ذات کے لیڈر محکوم طبقات کے مفاد کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ اسی لیے بابا صاحب امبیڈکر نے جمہوریت کی اس کمزوری کو ایک حد تک دور کرنے کے لیے اقلیتوں کے حقوق کو آئینی تحفظات فراہم کروائیں، مگر افسوس کہ سماج کے کمزور ترین طبقات کے مفاد کو بچانے کے بجائے اس پر مسلسل حملے کیے جارہے ہیں مگر ایک بہتر سماج کی تعمیر کے لیے یہ ضروری ہے کہ سماج کے کمزور ترین گروپ کی حالت کو بہتر کیا جائے۔ اگر کوئی ہندو مسلمان کے حقوق کے لیے آواز بلند کرتا ہے تو وہ نہ صرف مسلمان کا بھلا کرتا ہے بلکہ ملک کو بھی مضبوط بناتا ہے۔ ◻◻

ہندستان میں جمہوریت ہی نہیں سیکولرزم بھی دم توڑ رہا ہے

تحریر: کلیم الحفیظ

کانگریس کے سابق صدر نے کہا کہ یہ ملک ہندوؤں کا ہے مگر ہندوتوا وادیوں کا نہیں ہے۔ ان کے بقول گوڈسے ہندوتوا وادی تھا اور مہاتما گاندھی ہندو تھے لیکن وہ یہ کیوں بھول گئے کہ بھارت میں تقریباً ۴۰ فیصد لوگ وہ ہیں جو نہ ہندو ہیں اور نہ ہندوتوا وادی، جس میں پندرہ فیصد مسلمان، پندرہ فیصد بودھ، دو فیصد سکھ، تین فیصد عیسائی، ان کے علاوہ کہنے کو تو پارسی، جین، دلت، ناگا، لنگایت وغیرہ بھی خود کو ہندو تسلیم نہیں کرتے۔ اگر ان تمام طبقوں کو شمار کیا جائے تو ہندو اقلیت میں آجائیں گے۔ کانگریس لیڈر نے کس بنیاد پر کہہ دیا کہ یہ ملک ہندوؤں کا ہے۔ کانگریس کو حکومت بدر کرنے میں دراصل اسی طرح کے بیانات اور خیالات کا ہاتھ ہے۔ ایمرجنسی کے بعد جب دوبارہ کانگریس کی حکومت بنی، اسی وقت سے اس نے نرم ہندوتو کی راہ اپنالی تھی۔ بابری مسجد کا تالا کھولنے، مندر کا سنگ بنیاد رکھنے، انتخابی مہمات میں ناریل پھوڑنے، مندروں کے درشن کرنے سے لے کر مہنتوں کے پیر چھونے کے کام نرم ہندوتو کا پتہ دیتے ہیں۔ کانگریس یہ بھول گئی کہ جو لوگ سیکولرزم کے بجائے مذہب کو ترجیح دیں گے وہ نرم ہندوتو کو کیوں پسند کریں گے۔ انھیں تو گوڈسے والا ہندوتو ہی پسند آئے گا۔

ایک سیکولرزم تو وہ ہے جس میں مذہب کو کوئی جگہ نہیں، دوسرا سیکولرزم وہ ہے جہاں ریاست اور حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، وہ تمام مذاہب کے یکساں احترام پر یقین رکھتی اور عمل کرتی ہے۔ اس لحاظ سے اگر کوئی شخص انفرادی طور پر اپنے مذہب پر عمل کرتا ہے تو کوئی بات نہیں لیکن اگر وہ سیاسی لیڈر یا سیاسی جماعت کے صدر کی حیثیت میں مذہبی رسوم ادا کرتا ہے تو یہ بھارتی سیکولرزم کے منافی ہے۔

جمہوریت کا گلا تو مودی جی نے گھونٹ دیا۔ تمام جمہوری ادارے اپنا کردار بھول گئے۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رنجن گوگوئی کی شراب پارٹی نے جمہوریت کی چتا جلادی۔ موجودہ پارلیمنٹ کے اجلاس میں صحافیوں کے داخلے پر پابندی نے اظہار رائے کی آزادی کی پول کھول دی، درجنوں صحافیوں کو سچ بولنے کے جرم میں جیلوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا جس نے اپنا قلم بیچنے سے انکار کردیا، اس کا ہاتھ ہی توڑ دیا گیا۔ غرض ہر ادارے میں جمہوریت کی روح ختم کردی گئی۔ بی جے پی کا جمہوریت کا گلا گھونٹنا سمجھ میں آتا ہے لیکن کانگریس کا سیکولرزم کہاں چلا گیا ہے۔ راہل گاندھی کے بیان نے سیکولرزم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے۔

بھارتی سیکولرزم کی یہ خوبی تھی کہ یہاں عید اور دیوالی مل کر منائی جاتی تھی، یہاں درجنوں غیر مسلم شعراء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نعت لکھتے تھے، انھیں محمدؐ کی جن کے نام سے آج فاشسٹوں کو قے ہوتی ہے۔ یہاں رسکھان شری کرشن کے ایسے عقیدت مند تھے کہ ورنداون کو ہی اپنا گھر بنالیا تھا، یہاں نظیر اکبرآبادی تھے جنھوں نے ہندو تیوہاروں پر درجنوں نظمیں لکھیں، مگر آج وہی بھارت ہے جہاں مسلمانوں کی داڑھی، ٹوپی، کرتے پاجامے سے نفرت ہے۔ یہ وہی بھارت تھا کہ پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کی زبان اور لباس سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان ہے اور ان کو نماز کی امامت کے لیے مصلے پر کھڑا کردیا اور پنڈت جی نے بھی اپنی قرأت سے یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ جناب غیر مسلم ہیں اور آج وہی بھارت نماز پڑھنے کی مخالفت کررہا ہے، ہر جمعہ کو گڑگاؤں کے ہزاروں مسلمان نماز کے لیے پریشان رہتے ہیں۔ کبھی اسی بھارت کے تمام سرکاری دفاتر سیکولرزم کی تصویر پیش کرتے تھے، آج ہر سرکاری دفتر مندر بن گیا ہے۔

ابھی ایک زمین کی رجسٹری کے لیے مہرولی کے رجسٹرار ہاؤس جانا ہوا تو دیکھا کہ دفتروں میں لکشمی دیوی کی تصویریں ہیں، اسی طرح پولیس ہیڈکوارٹر میں ایک ایس ایچ او کے آفس میں شری رام آویزاں ہیں۔ میں تمام مذاہب کا احترام کرتا ہوں، اس لیے کہ میرا مذہب مجھے اسی کی تعلیم دیتا ہے لیکن میں سرکاری دفاتر میں مذہبی تصاویر کو اس لیے ناپسند کرتا ہوں کہ اس سے دوسرے مذاہب کے ماننے والے احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو تصویریں لگانا ہی ہیں تو تمام مذاہب کی لگایئے ورنہ بھارت کے ان مجاہدین آزادی کی لگایئے جنھوں نے اس ملک کی آزادی کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے ہیں۔

بھارت میں جس طرح جمہوریت اور سیکولرزم دم توڑ رہے ہیں، اس سے خطرہ ہے کہ یہاں ایک ایسا نظام حکومت آجائے گا جس میں مذہبی اقلیتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں رہے گی۔ نہ انھیں ملکیت کا حق ہوگا اور نہ انھیں ووٹ دینے کا اختیار ہوگا۔ مذہبی شدت پسندی کو جس طرح ہوا دی جارہی ہے، اس سے یہاں نفرت کے شعلے بھڑک اُٹھیں گے، ملک کے حکمرانوں کی زبانیں جو کچھ بول رہی ہیں وہ اس ملک کے مستقبل کے لیے اچھا نہیں ہے، خود کو سیکولرزم کا علمبردار سمجھنے والی پارٹیاں ہندوتو کے آگے جس طرح گھٹنے ٹیک رہی ہیں، وہ ملک کے لیے کوئی نیک فال نہیں ہے۔ اس سے صرف مذہبی اقلیتوں کو ہی نہیں خود ہندوؤں میں بھی دلتوں اور شودروں کو پریشانی ہوگی، اس لیے کہ منو کے نظام میں ان کے کوئی حقوق نہیں ہیں۔

ان حالات میں کیا لائحۂ عمل ہو، یہ سوچنے کی ضرورت ہے۔ سوچنے کا یہ کام ویسے تو ملت کے صاحب بصیرت لوگوں کا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس ضمن میں ہمیں اپنی مذہبی لیڈرشپ کی شکایت اور شکوے کے بجائے اپنی سیاسی لیڈرشپ سے سوال کرنا چاہیے۔ وہ لوگ جو مسلمانوں کے ووٹوں سے ایوان میں پہنچے ہیں، انھوں نے ہمارے لیے کیا کام کیا۔ آج بھی ۲۲ ممبران پارلیمنٹ ہیں، تقریباً ۱۶۰ ممبرانِ اسمبلی مختلف ریاستوں میں ہیں، جن میں کیرالہ میں ۳۲، آسام میں ۳۱، اترپردیش میں ۲۵، بہار میں ۱۹، مہاراشٹر میں ۱۰، راجستھان میں ۸، تلنگانہ میں ۸، کرناٹک میں ۸، اور دہلی میں ۶ ایم ایل اے ہیں۔ کشمیر کو چھوڑ کر بقیہ ریاستوں میں ایک ایک دو دو ہی مسلم نمائندے ہیں۔ اگر ہم لوکل باڈیز کی بات کریں تو کئی درجن شہروں اور ہزاروں گاؤں میں مسلمان اقتدار میں ہیں۔ یہ تو وہ تعداد ہے جو موجودہ وقت میں صاحب اختیار و اقتدار ہے۔ اس سے کہیں زیادہ وہ مسلم لیڈرشپ ہے جو الیکشن میں ہارنے کے بعد گھر بیٹھ گئی ہے۔ اگر یہ سارے مسلمان لیڈر اپنا اپنا رول ادا کرنے لگیں تو کیا کچھ نہیں کرسکتے۔ جو لوگ علمائے دین سے ایک ہونے کی بات کرتے ہیں، وہ اپنی سیاسی لیڈرشپ سے ایک ہونے کا مطالبہ کیوں نہیں کرتے؟ آخر ہماری دنیا کی کامیابی تو اس سیاسی لیڈرشپ کے ہاتھ میں ہے۔ ❑❑

جمہوریت کا گلا تو مودی جی نے گھونٹ دیا۔ تمام جمہوری ادارے اپنا کردار بھول گئے۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رنجن گوگوئی کی شراب پارٹی نے جمہوریت کی چتا جلادی۔ موجودہ پارلیمنٹ کے اجلاس میں صحافیوں کے داخلے پر پابندی نے اظہار رائے کی آزادی کی پول کھول دی، درجنوں صحافیوں کو سچ بولنے کے جرم میں جیلوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا جس نے اپنا قلم بیچنے سے انکار کردیا، اس کا ہاتھ ہی توڑ دیا گیا۔ غرض ہر ادارے میں جمہوریت کی روح ختم کردی گئی۔

اقلیتوں کو اپنے دستوری حقوق سے واقف ہونا ضروری

تحریر: عبدالنصیر ناصر

بین الاقوامی سطح پر پوری دنیا میں مذہبی، لسانی، قومی ونسلی شناخت رکھنے والی اقلیتوں کے حقوق کے سلسلے میں اقوامِ متحدہ کی جانب سے شہری وسیاسی حقوق کے بین الاقوامی میثاق کی دفعہ ۹ کے تحت متعلقہ ملکوں کے اربابِ اقتدار کو ان کے ملک کے اندر بسنے والی اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری تفویض کی گئی ہے۔ ہندستانی آئین کے بنیادی حقوق کی حدود میں مذہبی ولسانی اقلیتوں کے حقوق کے تعلق سے اس میں جگہ جگہ ذمہ داریوں کی ضمانتیں موجود ہیں۔ اسی پس منظر میں اقلیتوں کے آئینی حقوق کو تقویت پہنچانے کے لیے ہر سال قومی سطح پر ۱۸ر دسمبر کے دن 'عالمی یوم حقوق اقلیت' منایا جاتا ہے۔ ہندستان ایک جمہوری ملک ہے مگر یہاں اقلیتوں کے حقوق کی نہ صرف ان دیکھی کی جاتی رہی، بلکہ یہ ملک بھر میں ایک بے حد تکلیف دہ اور حساس ترین مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ہمارا ملک اپنی تہذیبی ثقافت کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، علاوہ ازیں اپنے آئین اور پھر کثرت میں وحدت کے فلسفے کی بنیاد پر یہ دنیا بھر میں بہت ہی ممتاز مقام رکھتا ہے۔ یہ ملک زبان، ذات، برادری، رنگ ونسل اور مذہب کی بنیاد پر کسی طرح کی نابرابری اور تفریق کا متحمل نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہاں کا آئین سبھی شہریوں بالخصوص یہاں کی اقلیتوں کو ہر پہلو سے متفرق ضمانت کی یقین دہانی کراتا ہے۔

ہندستانی آئین کی دفعہ ۲۵ کے تحت سبھی شہریوں کو مذہبی آزادی دی گئی ہے، جبکہ دفعہ ۳۰ کے تحت یہاں کی اقلیتوں کو اپنے انداز کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام و انصرام چلانے کے حق کی بھی پوری یقین دہانی کرائی گئی ہے۔ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ ان کے ساتھ کسی طرح کی تفریق نہیں کی جائے گی اور بغیر کسی جانب داری کے ایسے قائم شدہ اقلیتی تعلیمی اداروں کو ان کے تعلیمی فروغ کے لیے مالی امداد بھی فراہم کی جائے گی۔ عوامی روزگار میں بھی کسی بھی مذہبی یا لسانی اقلیت کے ساتھ عدم مساوات یا تفریق کا معاملہ نہیں کیے جانے کی ضمانت دی گئی ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ان دستوری ضمانتوں کے بعد بھی ملک کے اندر اقلیتوں کے ساتھ غیر معمولی امتیاز وتفریق کا معاملہ کیا جارہا ہے۔ اس طرح کے بے شمار مسائل ہیں۔ ہندستان کی ریاستوں میں اقلیتیں الگ الگ فیصد میں ہیں، سبھی قومیں اپنے اپنے مذہبی مقامات پر عبادت کرنے اور اپنے عقیدے کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہیں۔ انھیں اپنی برادری کی فلاح و بہبود کے لیے تعلیمی ادارے چلانے، کہیں بھی رہنے اور مکانات تعمیر کرنے کا حق حاصل ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہاں اقلیتیں تمام فوائد سے لطف اندوز ہورہی ہیں۔ ملازمتیں، تحفظات، تعلیم اور ترقی کے لیے خصوصی پیکیج اور فلاح و بہبود کے دیگر تمام حقوق آئین کے دائرے میں حاصل کررہے ہیں۔

وہ ملک کی سیاست، انتظامیہ، دفاع، فضائیہ، بحریہ اور دیگر سرکاری ملازمتوں میں شامل ہوکر، مختلف پلیٹ فارموں پر کام کرکے اپنی برادری کو ترقی سے ہمکنار کررہے ہیں۔ ملک میں اقلیتوں کو بھی اتنے ہی حقوق حاصل ہیں جتنے اکثریت کو حاصل ہیں۔ درحقیقت اقلیتوں کو اپنی ذات اور تحفظات کی وجہ سے مخصوص ہندستانی ملازمتوں میں استحقاق ملتا ہے جو سرکاری ملازمتوں کے حصول میں ان کی مدد کرتا ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد سے لے کر آج تک اقلیتوں کے حقوق کو پامال کرنے اور انھیں نفسیاتی طور پر دوسرے درجے کا شہری بنا دینے کی جو روایت ملک کے اندر سیاسی سطح پر قائم کی گئی، اس نے یہاں کے اقلیتی طبقہ کے عدم تحفظ کے احساس کو جنم دینے کے ساتھ ان کے لیے ترقی کے سارے راستے بھی مسدود کردیئے، ایسی بھیانک صورتِ حال میں نئی نسل کے بہتر تعلیمی و معاشی مستقبل کے لیے ہمیں اپنی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے نہ صرف مؤثر اقدامات کرنے ہوں گے بلکہ انھیں قانونی بنیادوں پر ایسی راہیں بتاتی ہوں گی جن پر چل کر خوداعتمادی کے ساتھ کامیابی کی سمت بڑھنا ان کے لیے آسان ہو، اگر ہم ملک میں ایک بہتر تبدیلی چاہتے ہیں تو اس کے لیے ملک میں پھیلی نفرت وتعصب کے ماحول کو محبت سے بجھانے کی کوشش کرنی ہوگی اور دستوری طور پر حاصل حقوق کے سہارے اپنی مثبت پیش رفتیں جاری رکھنی ہوں گی۔ اقلیتیں موجودہ دور میں صبر آزما دور سے گزر رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورتحال میں ہم جمہوری دستور کی پاسداری کے بغیر ملک سے اس نفرت کے ماحول کا خاتمہ نہیں کرسکتے۔ ملک کے اندر اقلیتوں کے حقوق کو نظرانداز کرکے ہندستان عالمی سطح پر اپنی کوئی منفرد شناخت نہیں بنا سکتا اس لیے ان سب موضوعات پر ہماری حکومتوں کو سنجیدگی وایمانداری سے غور کرنا ہوگا۔ اقلیتی طبقوں بالخصوص مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ضلع اور بلاک کی سطح پر بین الاقوامی یوم حقوق اقلیت کے تحت ۱۸ر دسمبر کو پروگراموں کا انعقاد کریں اور ان میں اقلیتوں کے تمام نمائندہ طبقوں کو شامل کریں۔ ❑❑

جمہوریت میں اقلیتوں کے حقوق

کیا ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے اور تمام اندیشے اپنے سامنے لاسکتی ہے جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کردیتے ہیں (خود ہی جواب تحریر فرماتے ہیں) ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی ہے اور اس لیے انھیں ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا غلط دیواریں چنی جانے لگیں، ایک طرف خود مسلمانوں پر ان کی حیثیت مشتبہ کردی اور دوسری طرف دنیا کو ایک غلط فہمی میں مبتلا کردیا جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورتحال میں نہیں دیکھ سکتی۔ درحقیقت برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین پر وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے ان میں سے ایک بیج یہ بھی تھا اُس نے فوراً پھول پتے پیدا کئے اور گو پچاس برس گذر چکے ہیں مگر ابھی تک اس کی جڑیں خشک نہیں ہوئی ہیں۔ سیاسی بول چال میں جب کبھی ''اقلیت'' کا لفظ بولا جاتا ہے اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام قاعدہ کے مطابق انسانی افراد کی ہر وہ تعداد جو دوسری تعداد سے کم ہو لازمی طور پر اقلیت ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب رہنا چاہیے بلکہ مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت دونوں اعتبار سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لیے خود اپنے اوپر اعتماد کرسکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد دوسرے سے کم ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بجائے خود کم ہو اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جاسکے۔ پھر تعداد کے ساتھ نوعیت کی بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک ملک میں دو گروہ ہیں، ایک کی تعداد ایک کروڑ اور دوسرے کی تعداد دو کروڑ۔ ظاہر ہے کہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہے مگر سیاسی اعتبار سے یہ نسبتی فرق کافی نہ ہوگا کہ ہم ایک کروڑ کو اقلیت فرض کرکے اس کی کمزوری کا اعتراف کرلیں۔ بلکہ اس کا فیصلہ دوسرے عوامل اور صلاحیتوں کو سامنے رکھ کر ہی کیا جاچکے گا۔ اس لحاظ سے ہندوستان پر مسلمانوں کی حیثیت پر غور کیجیے آپ دیکھیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے اس کی نسبت اقلیت کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صاف دھوکہ دینا ہے۔ (مولانا ابوالکلام آزادی، خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۴۰ء)

بقیہ— جمہوریت میں قیادت....

غیر مطبوعہ ریکارڈ میں اس طرح کی باتوں کا کوئی ذکر وحوالہ نہیں ہے، اختلاف واتفاق کو جمعیۃ علماء ہند اور اس کے دیگر رہنماؤں، سمیت مولانا مدنی، امارت شرعیہ اور اس کے دیگر کلیدی عہدے داروں سمیت ابوالمحاسن محمد سجاد کے درمیان اشتراک واتحاد تھا، اس تناظر میں تنظیم اور اس کے اکابر کو ایک دوسرے سے الگ دِکھانے کی کوشش کوئی راست رویہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔

البتہ مولانا محمد منظور نعمانی لیگ اور کانگریس، جمعیۃ علماء ہند میں سے کسی کے موقف و نقطۂ نظر کے ساتھ پوری طرح کھڑے اور متفق نہیں تھے۔ اس کی تصویب وتائید کے لیے مولانا محمد سجاد کے حوالے سے بحث زیادہ مفید ونتیجہ خیز نہیں ہوگی۔ خود مولانا سجاد نعمانی بھی تذبذب کے ساتھ بیچ بیچ میں چل رہے ہیں۔ جہاں وہ ایک آزاد، اصولی سوچ والی اپنی سیاسی پارٹی کی تشکیل اور اسی کو طاقتور بنانا لازم بتارہے ہیں تو وہیں دوسری طرف لکھ رہے ہیں کہ موجودہ نازک ترین اور پیچیدہ مرحلے سے گزرتے ہوئے فی الحال مسلمانوں کے لیے اپنی الگ سیاسی پارٹی کا ملک کے اکثر مقامات پر نقصان فائدے سے بہت زیادہ ہوگا، فی الحال اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ ہم نہایت سمجھ داری کے ساتھ اس پارٹی کی حمایت کریں جو ہمارے لیے بہت زیادہ مفید نہیں تو بہت زیادہ نقصان دہ بھی نہیں، سوال یہ ہے کہ ۱۹۴۰ء میں مولانا محمد سجاد کے انتقال کے بعد ملک کی آزادی سے اب تک ملک وملت کے اکابر اور مسلم جماعتوں اور تنظیموں کے ذمہ داران اور کیا کچھ کرتے آرہے ہیں۔□□

بقیہ— انڈین چائلڈ میریج بل....

حکومت ترقی کرنا چاہ رہی ہے۔

ایں خیال است ومحال است وجنوں؟ اگر سرکار واقعی ان جیسی تباہی اور بگاڑ کے ازالہ کے سلسلہ میں فکر مند ہے تو اسے اپنے قانون پر نظر ثانی کر لینی چاہئے، اور اگر چہ حالیہ چرچوں میں لو جہاد کے نام پر مسلمانوں پر نشانہ سادھا گیا لیکن اس کا ایک پہلو صحیح بھی ہے، جو مدھیہ پردیش کے بی جے پی ودھایک گوپال پرمرنے اپنے بھاشن میں کہا ''جب سے سرکار نے لڑکی کی شادی کے لئے اٹھارہ برس کی عمر مقرر کی ہے، تب ہی سے لڑکیاں بھاگ بھاگ کر شادیاں کرنے لگی ہیں اور لو جہاد شروع ہوگیا ہے'' اس لئے ہماری شریعت نے جس وقت کی تعیین کی اس کے استحکام دیکھئے کہ چودہ سو سال کے بعد بھی اس پر کوئی انگلی نہیں اٹھی، اس کے ساتھ ساتھ ۲۰۱۲ء کے دہلی ہائی کورٹ اور ۲۰۱۴ء کے گجرات ہائی کورٹ کے اس فیصلے کا بھی ہم سمّان کرتے ہیں، کہ دونوں ایوانوں نے بلوغت کو نکاح کی عمر مقرر کرنے کا اشارہ دیتے ہوئے یہ مشترکہ حکم صادر کیا تھا، کہ اگر مسلمان لڑکی ۱۵ برس کی عمر میں ہی شادی کرلے تو یہ غیر قانونی نہیں ہے۔ (ماخوذ از نکاح میں تاخیر کیوں؟ ص۹۱، مؤلف ابو درداء عراقی)□□

بقیہ:—— مراسلات

ہم سے متنفر ہوتے جارہے ہیں۔

مختصر یہ کہ معاشرے سے اعلیٰ اخلاقی قدریں زوال پذیر ہوتی جارہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا معاشرہ اور ہماری قوم عروج وارتقا کے منازل سے انحطاط وپستی کی طرف تیزی سے گامزن ہے، جس نے آج ہمیں تباہی وبربادی کے دہانے پر لاکر کھڑا کردیا ہے۔ ان برائیوں سے نکلنے کے لیے ہمیں قرآن کو کما حقہ پڑھ کر سمجھنا ہوگا اور آپ کے اوصاف جمیلہ اور اخلاقِ حمیدہ کو اپنی زندگی میں داخل کرنا ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق وکردار کس قدر بلند وبالا ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں آپ کے اس فرمان سے ہوتا ہے، آپ نے فرمایا کہ بے شک تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو تم میں عادت کے لحاظ سے بہتر ہو۔

محمد احمد حسن سعدی امجدی

ریسرچ اسکالر، البرکات اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ

بقیہ:—— دریچے

تاکہ وہ مارکیٹ میں اس بدلے وقت میں اپنا وجود قائم رکھ سکیں۔ دوسری جانب تیزی سے اوپر کی جانب بڑھتے ہوئے سفر کے کرایہ، گیس، بجلی اور پانی کے نرخ کم آمدنی والے اور بے روزگار افراد اور خاندانوں کو بری طرح متاثر کررہے ہیں۔ یہ بڑھتا ہوا مہنگائی اور بے روزگاری کا سیلاب بڑے ضطراب اور طوفان کے خطرات کا باعث بن رہا ہے۔ خصوصی طور پر ایسے وقت میں جب ایک طرف کورونا کا خوف ہے تو دوسری طرف عوام مہنگائی سے تنگ آتے جارہے ہیں، ساتھ ہی ان کے سوشل بینی فٹس اور الاؤنسز پر حکومتی پالیسیاں کاری ضرب لگارہی ہیں جس کی وجہ سے ٹریڈ یونین اور دوسرے گروہ سڑکوں پر آنے کے منصوبے بنارہے ہیں۔ موجودہ حکومت کی پالیسیاں معیشت کو بحران سے نکالنے میں بری طرح ناکام ہوچکی ہیں۔ خدشہ یہ ہے کہ جس طریقے سے حکومتی حکمت عملی سے برطانیہ کی معیشت سکڑتی جارہی ہے اس میں ماہرین کا خیال ہے کہ مستقبل میں لوگوں کی انکم اور وسائل آج کے لیول پر یا اس سے بھی کم ہوجائیں گے جو کہ پریشان کن صورتِ حال ہے۔ دوسری جانب اعداد وشمار یہ بھی بتارہے ہیں کہ موجودہ حکومتی پالیسی سے برطانیہ کی امیر ترین کلاس اور کمپنیاں کافی مال بنارہی ہیں۔ اس وقت ایک فیصد امیر لوگوں کے پاس برطانیہ کی دولت کا ۲۱ فیصد ہے لیکن حکومت بضد ہے کہ غریب طبقے کی سہولیات اور مراعات کو کم کرنے کی پالیسی سے حالات بہتر ہوجائیں گے۔ دراصل یہ موجودہ حکومت امیر ترین کلاس کی فطری اتحادی ہے جو حکومت پر مسلسل خسارہ کم کرنے کا دباؤ ڈال رہے ہیں اور یہ تمام خسارہ صرف نچلے طبقے پر بوجھ میں اضافہ کرکے پورا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس حکمت عملی کے خطرناک اور دوررس اثرات مرتب ہوں گے لیکن حکومت پبلک سیکٹر کو سکیڑنا یا ختم کرنا چاہتی ہے اور ویلفیئر اسٹیٹ کی بنیاد کو ہلانا چاہتی ہے جس میں ٹریڈ یونین کی حوصلہ شکنی اور خاتمہ بھی مقصود ہے۔

دنیا کا عظیم ترین

سکندر اعظم بھارت میں طاقت کا کیپسول

نیا بھروسہ ایک ہی کیپسول سے زبردست طاقت و جسمانی کمزوری دور کریں

میڈیکل اسٹور سے خریدیں یا فون کریں:

0921235867, 09015270020

نتیش نے دیا بی جے پی کو جھٹکا، جے ڈی یو کا یوپی میں تنہا انتخاب لڑنے کا اعلان

جے ڈی یو کا اس طرح سے یوپی میں علیحدہ سے اپنے امیدوار کھڑے کرنے کا اعلان بی جے پی کے لئے جھٹکا قرار دیا جا رہا ہے

اترپردیش میں اسمبلی انتخابات کے لیے ووٹنگ شروع ہونے میں چند ہفتے باقی ہیں اور سیاسی جماعتیں اپنے امیدواروں کے ناموں کا اعلان کر رہی ہیں۔ کڑاکے کی سردی کے درمیان انتخابات ماحول کو گرما رہے ہیں اور کئی دلچسپ باتیں سامنے آرہی ہیں۔ یوں تو مہاراشٹر سے تعلق رکھنے والی پارٹی شیوسینا بھی امیدوار اتارنے کی بات کررہی ہے لیکن بہار کی جنتا دل یونائیٹڈ (جے ڈی یو) نے بھی حیران کن اعلان کیا ہے۔ این ڈی ٹی وی کی رپورٹ کے مطابق بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار کی پارٹی اور بی جے پی کی اتحادی جے ڈی یو بھی یوپی انتخابات میں اپنے امیدوار اتار رہی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بی جے پی کے زیر قیادت این ڈی اے کے اتحادی اور بی جے پی کی حمایت سے بہار میں مخلوط حکومت چلانے والے نتیش کمار بھی یوپی میں اپنی پارٹی کے امیدواروں کے لیے مہم چلا سکتے ہیں۔ جے ڈی یو کا اس طرح سے یوپی میں علیحدہ اپنے امیدوار کھڑے کرنے کا اعلان بی جے پی کے لئے جھٹکا قرار دیا جارہا ہے۔ جے ڈی یو کے پاس یوپی میں کوئی انتخابی زمین نہیں ہے اور سال ۲۰۱۹ء میں جھارکھنڈ اسمبلی انتخابات میں پارٹی نے کچھ سیٹوں پر اپنے امیدوار کھڑے کیے تھے لیکن نتیش کمار نے وہاں مہم نہیں چلائی تھی۔ اب جبکہ بہار میں بی جے پی کافی مضبوط ہوچکی ہے، یوپی میں این ڈی اے سے مختلف امیدوار کھڑے کرنا دلچسپ ہے۔ جے ڈی یو نے یہ فیصلہ ایسے وقت میں کیا ہے جب بہار بی جے پی اور جے ڈی یو کے درمیان لڑائی کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ بہار حکومت میں اتحادی شراکت دار کچھ مسائل پر آپس میں دست وگریباں ہیں۔ شراب پر پابندی، ذات پات کی مردم شماری اور شہنشاہ اشوک کے بارے میں بی جے پی کے ایک سابق رکن کے متنازع ریمارکس پر دونوں پارٹیوں کے درمیان کشیدگی ہے۔ ابھی پیر کو ہی بہار بی جے پی کے صدر ڈاکٹر سنجے جیسوال نے کہا تھا کہ ''اتحادیوں کے درمیان براہ راست بات چیت ہونی چاہیے۔ اگر ٹوئٹر-ٹوئٹر کھیلیں گے تو بی جے پی کے ۷۶ لاکھ کارکن اس کا جواب دینا اچھی طرح جانتے ہیں۔''

بقیہ— انٹرنیٹ کے ذریعہ....

بے شامل ہیں۔ پروڈکٹ کو بیچنے کے لیے آپ اپنی ویب سائٹ یا بلاگ بناسکتے ہیں یا ویڈیو کے ذریعے ان کی پروموشن کرسکتے ہیں۔

فائیور: فائیور ایک ایسی ویب سائٹ ہے جہاں آپ جو بھی مہارت رکھتے ہیں وہ شائع کردیتے ہیں اور پھر جس شخص کو ضرورت ہوتی ہے وہ آپ سے رابطہ کرلیتا ہے اور جب آپ کام مکمل کرلیتے ہیں تو آپ کو اس کے عوض پیسے مل جاتے ہیں۔

ورچول اسسٹنٹ: ورچول اسسٹنٹ کا کام بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ آپ اپنے ملک میں رہتے ہوئے اسسٹنٹ کا کام کرتے ہیں۔ اس میں فرق صرف اتنا ہے کہ آپ یہ کام انٹرنیٹ کے ذریعے کررہے ہوتے ہیں۔ یورپ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں مختلف افراد اور اداروں کو روزمرہ کے کام انجام دینے کے لیے افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر وہ یہ افراد اپنے ملک سے ہائر کریں گے تو انھیں اس کے عوض بھاری تنخواہ ادا کرنی پڑے گی اس لیے وہ تیسری دنیا کے ممالک میں جہاں افرادی قوت کافی سستی ہے، رابطہ کرتے ہیں اور یہاں سے افراد کو ہائر کرلیتے ہیں، اس کام کو حاصل کرنے کے لیے آپ کو انگریزی زبان پر مضبوط گرفت، کمیونی کیشن اسکل اور نیٹ ورکنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔

یوٹیوب: یوٹیوب کے چینل کے ذریعے کمائی سب سے بہترین اور مثبت ذریعہ روزگار ہے۔ اس کا طریقۂ کار یہ ہے کہ آپ یوٹیوب پر چینل بنا کر اس پر مفید ویڈیوز اور دیگر دلچسپ موضوعات پر ویڈیو شیئر کرتے ہیں۔ اگر آپ کی ویڈیو ایک ہزار لوگ دیکھتے ہیں تو اس پر آپ کو ڈالر میں معاوضہ ملتا ہے۔ اگر آپ کی ویڈیو لاکھوں ویورز تک پہنچ جاتی ہے تو اس سے اچھی خاصی معقول آمدنی ہوسکتی ہے۔

گوگل ایڈسینس: دوسرا اہم ذریعہ گوگل ایڈسینس کے ذریعے اشتہارات کی نمائش ہے۔ اس کے لیے آپ کو دو کام کرنے پڑتے ہیں۔ ایک تو ذاتی ویب سائٹ یا بلاگ اور دوسرا ایڈسینس کا اکاؤنٹ۔ پہلے آپ ایڈسینس کا اکاؤنٹ بنا کر وہاں سے اشتہارات لیتے ہیں، جو ایک خاص لنک کی شکل میں آپ کو ملتا ہے پھر اس لنک کو اپنی ویب سائٹ پر اپ لوڈ کرتے ہیں تو خودکار طریقے سے وہ اشتہار آپ کی سائٹ پر نظر آتا ہے۔ اس اشتہارات کو جتنے لوگ دیکھتے ہیں اس سے ہونے والی آمدنی کا کم وبیش ۶۸ فیصد حصہ آپ کو ملتا ہے۔□□

بقیہ— جمہوریت میں اقلیت....

مضبوط کرکے ہم بہت کچھ حاصل کرسکتے ہیں۔ جبکہ زمینی حقیقت یہ ہے کہ تعلیم میں ہم دوسروں کے برابر ہونا تو دور کی بات ہے اس سے کافی پیچھے ہیں۔ اس سلسلے میں اسرائیل کو دیکھئے کہ یہودی پوری دنیا کی آبادی کا شاید ایک فیصد بھی نہیں ہیں، لیکن تعلیم اور محنت کے بل بوتے پر وہ پوری دنیا کی سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی رہنمائی انجام دے رہے ہیں اور اس قدر اثر ورسوخ بنا رکھا ہے کہ ہم اس کا تصور بھی شاید نہ کرسکیں۔

بحیثیت اقلیت ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے دین پر سختی سے قائم رہیں اور اپنے مذہب اور مذہبی تشخص کی اچھی طرح حفاظت کریں۔ ایسا نہ ہو کہ اکثریت سے مرعوب ہو کر یا ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہم اپنے عقیدے اور مذہبی شناخت سے دستبردار ہوجائیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا کوئی دنیوی فائدہ بھی نہیں بلکہ یہ محض ایک فریب ہے، اس کی وجہ سے ہم دین ودنیا دونوں کو برباد کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''جو شخص لوگوں کو ناراض کرکے اللہ کی رضا کا طلبگار ہو تو لوگوں سے پہنچنے والی تکلیف کے سلسلے میں اللہ اس کے لیے کافی ہوگا اور جو اللہ کو ناراض کرکے لوگوں کی رضا کا طلبگار ہو تو اللہ تعالیٰ انھیں لوگوں کو اسے تکلیف دینے کے لیے مقرر کردے گا۔'' (سنن ترمذی: ۲۴۱۴)

جو شخص لوگوں کو ناراض کرکے اللہ کی رضا کا طلبگار ہو تو لوگوں سے پہنچنے والی تکلیف کے سلسلے میں اللہ اس کے لیے کافی ہوگا اور جو اللہ کو ناراض کرکے لوگوں کی رضا کا طلب گار ہو تو اللہ تعالیٰ انھیں لوگوں کو اسے تکلیف دینے کے لیے مقرر کردے گا۔

ایک دوسری روایت میں حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں: ''جو لوگوں کو ناراض کرکے اللہ کی رضامندی تلاش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوجاتا ہے اور لوگوں کو بھی اس سے راضی کردیتا ہے اور جو اللہ کو ناراض کرکے لوگوں کی رضامندی کا متلاشی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوجاتا ہے اور لوگوں کو بھی اس سے ناراض کردیتا ہے۔'' (الترغیب والترہیب: ۲۲۵۰)

خلاصہ یہ ہے کہ ہم قلت تعداد کو اپنی کمزوری اور بے وزنی کا سبب ہرگز نہ سمجھیں۔ شرعی تعلیمات نہ اس بات کی تائید کرتی ہیں اور نہ ہی تاریخی حقائق سے یہ بات سچ ثابت ہوئی ہے، بلکہ ہماری بے وقعتی اور ذلت وپستی کا سبب ایمان وعمل اور اخلاق وکردار سے دوری ہے۔ ہمیں اس زاویے سے اپنا محاسبہ کرنے اور اپنی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس بات کی توفیق عطا فرمائے اور ایمان وعمل کی کمزوری کو دور کرنے اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی ہدایت دے۔ آمین□□

بقیہ— منظر پس منظر

بھی اس سال کے سویڈن کے ایک اور ادارے ڈیم وی جو مختلف ممالک میں جمہوریت کی سطحوں پر نظر رکھتا ہے اور واشنگٹن میں قائم فریڈم ہاؤس سے مطابقت رکھتا ہے، کے مطابق وجوہات کئی ہیں۔ گلوبلائزیشن کو دنیا کو ہموار کرنا تھا۔

اس کے بجائے یہ بہت سے ممالک اور برادریوں کے لیے زیادہ ناہموار بن گیا جس سے تحفظ پسند اور قوم پرستانہ روش کو تقویت ملی۔ ۲۰۰۸ء کے مالیاتی بحران اور اس کے بعد کووڈ-۱۹ نے معاشی وسائل رکھنے اور نہ رکھنے والوں کے درمیان خلیج کو مزید وسیع کردیا ہے۔ وبائی مرض کے ابتدائی مہینوں میں جمہوریتوں نے چین اور سنگاپور جیسی غیر لبرل حکومتوں کے مقابلے میں وائرس پر قابو پانے کے لیے جدوجہد کی اور جمہوریت کا بحران اس وقت تیزی سے بڑھتا گیا جب اس کی ساکھ کو ایک ایسی قوم یعنی امریکہ کی طرف سے سخت ترین حملے کا سامنا کرنا پڑا جسے طویل عرصے سے آئیڈیل کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہے۔ سابق امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ کی جانب سے ۲۰۲۰ء کے انتخابات کی قانونی حیثیت پر سوال اُٹھانے کے بعد جو وہ ہار گئے تھے، میانمار کے جرنیلوں نے ان انتخابات میں دھاندلی کا الزام لگایا تھا جو اس سال نوبل انعام یافتہ آنگ سان سوچی کی پارٹی نے جیتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ پیرو میں، بدنام زمانہ سابق صدر البرٹو فوجیموری کی بیٹی کیکو فوجیموری نے اس جون میں اسکول ٹیچر پیڈرو کاسٹیلو کے انتخاب کو روکنے کے لیے بے قاعدگیوں کا دعویٰ کیا اور برازیل میں صدر جائر بولسونارو پہلے ہی اصرار کررہے ہیں کہ اگلے سال کے انتخابات میں ان کے خلاف دھاندلی کی جائے گی، لیکن اس سے بھی لڑنے کے طریقے ہیں۔ جرمنی سے کینیڈا تک، گروپ، شہریوں کے بڑے اجتماعات کا اہتمام کررہے ہیں، جن میں موسمیاتی تبدیلی سے لے کر خارجہ پالیسی تک ہر چیز پر بحث ہوتی ہے۔ ان کی سفارشات پر عمل درآمد لازمی نہیں ہے لیکن وہ حکومتوں پر دباؤ ڈالنے میں مدد کرتی ہیں جبکہ عام لوگوں کو ان کے ووٹ سے بڑھ کر آواز فراہم کرتی ہیں۔ دریں اثنا اٹلی کے اسکول، بچوں کو جعلی خبروں کی شناخت کرنے کا طریقہ سکھا رہے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ دوسری جمہوریتیں قدم بڑھائیں۔ جمہوریت اب بھی اپنے آپ کو درست کرسکتی ہے۔ یہ تاریخ کا خاتمہ نہیں ہے۔□□

دہلی میں پناہ گزیں روہنگیا کے درمیان جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے گرم کپڑے اور راشن تقسیم

نئی دہلی ۱۴ر جنوری ۲۰۲۲ء: جمعیۃ علماء ہند کے قومی صدر مولانا محمود مدنی کی ہدایت پر دہلی اور این سی آر میں روہنگیائی مہاجرین کے درمیان کمبل، لحاف، لیدر جیکٹ اور راشن وغیرہ تقسیم کیے گئے۔ شرم وہار ۹۹ر خاندان، کھجوری میں ۷۸ خاندان، کالندی کنج میں ۵۷ خاندان، فرید آباد میں ۳۵، اور اتم نگر میں ۶۳ خاندانوں میں یہ اشیاء تقسیم کی گئیں۔

واضح ہو کہ دہلی میں سخت سردی اور لاک ڈاؤن کی وجہ سے مہاجرین کو بہت ساری پریشانیوں کا سامنا ہے۔ جمعیۃ علماء ہند انسانی بنیاد پر ان ضرورت مندوں کی مدد کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح قاری عبدالسمیع جنرل سکریٹری دینی تعلیمی بورڈ جمعیۃ علماء صوبہ دہلی نے باہری دہلی کے علاقے میں جمعیۃ کے بینر کے تحت لحاف تقسیم کیے ہیں۔

آج جمعیۃ علماء ہند کے آرگنائزر مولانا غیور احمد قاسمی نے بتایا کہ روہنگیا روئے زمین کے سب سے مظلوم انسان ہیں، وہ ہمارے ملک میں پناہ لیے ہوئے ہیں، جب تک یہاں ہیں یہ ہماری قومی، ملکی و دینی ذمہ داری ہے کہ ان کی مدد کریں۔ اس سے ہمارے وطن کی نیک نامی بھی ہوتی ہے اور اس سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمیں اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ انھوں نے دیگر اہل خیر حضرات اور تنظیموں کو بھی متوجہ کیا کہ وہ ان کی مدد کے لیے آگے آئیں۔

تقسیم کے عمل کے موقع پر حاجی محمد یوسف نائب مولانا عابد قاسمی صدر جمعیۃ علماء صوبہ دہلی، مولانا اسلام الدین قاسمی ناظم اعلی جمعیۃ علماء صوبہ دہلی، صدر جمعیۃ علماء صوبہ دہلی، مولانا اخلاق قاسمی ناظم جمعیۃ علماء شمالی مشرقی دہلی، مولانا ضیاء اللہ قاسمی آرگنائزر جمعیۃ علماء ہند، قاری ہارون اسعدی، حاجی محمد اسعد میاں خادم الحجاج و ناظم جمعیۃ علماء نئی دہلی، مولانا تنویر، مرکزی دفتر جمعیۃ علماء ہند سے حاجی محمد مبشر، حاجی محمد عارف، مولانا یٰسین جہازی، مولانا عرفان قاسمی وغیرہ بھی موجود تھے۔

مجلس احرار اسلام ہند کے قومی صدر منتخب ہونے پر مولانا محمد عثمان لدھیانوی کو مرکز تحفظ اسلام ہند نے دی مبارکباد

بنگلور، ۷ر جنوری: پچھلے دنوں قائد الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن ثانی لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال سے خالی ہوئی مجلس احرار اسلام ہند کے عہدہ صدارت کو پُر کرنے کیلئے مجلس احرار کی اراکین عاملہ کا ایک اجلاس صدر دفتر جامع مسجد لدھیانہ میں منعقد ہوا جس میں اتفاق رائے سے حضرت قائد الاحرار کے جانشین حضرت مولانا محمد عثمان رحمانی لدھیانوی مظاہری صاحب کو مجلس احرار اسلام ہند کا قومی صدر منتخب کرلیا گیا۔ احرار کے قومی صدر کے طور پر مولانا کے انتخاب سے عموماً پورے ملک بالخصوص رضا کاران احرار میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس پر مسرت موقع پر مجلس احرار اسلام بنگلور کے صدر اور مرکز تحفظ اسلام ہند کے بانی و ڈائریکٹر محمد فرقان نے نومنتخب صدر احرار حضرت مولانا عثمان لدھیانوی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اس حسن انتخاب سے پورے ملک میں مجلس احرار اسلام مزید مستحکم اور سرگرم عمل بنے گی کیونکہ نومنتخب صدر احرار نے بچپن سے ہی اپنے اجداد کی روایات پر عمل کرنا شروع کردیا تھا اور زمانہ طالب علمی سے ہی منکر ختم نبوت فتنہ قادیانیت کے خلاف محاذ کھول رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قادیانیوں کے جھوٹے مقدمے کی وجہ سے انہیں اپنی زندگی کے پانچ سال زنداں میں گزارنے پڑے، لیکن پرچم احرار کو کبھی گرنے نہیں دیا بلکہ ہمیشہ بلند رکھا۔ رہائی کے چند سال بعد ہی ان کی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اتفاق رائے سے ۲۰۰۸ء میں وہ مجلس احرار اسلام ہند کے قومی جنرل سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔ جس کے بعد سے آج تک اس عہدے پر فائز رہے۔

محمد فرقان نے فرمایا کہ نومنتخب صدر احرار مولانا عثمان لدھیانوی جب احرار کے قومی جنرل سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے تو انہوں نے قائد الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن ثانی لدھیانویؒ کی سرپرستی ونگرانی اور اپنی صلاحیتوں ومحنتوں سے ملک کے مختلف حصوں میں پرچم احرار کو بلند کیا تھا اور شاخیں قائم کیں تھیں۔ لہٰذا ایسی شخصیت کا انتخاب ملت اسلامیہ ہندیہ کے لئے نہایت موزوں اور مفید تر ہے، جن کی زندگی کا اکثر حصہ عقیدہ ختم نبوت کی حفاظت اور قادیانیوں کے تعاقب میں گزرا ہے۔ محمد فرقان نے فرمایا کہ آج بھی احرار میں وہی جذبۂ حریت، بے خوف، حق گوئی کی صفات موجود ہے جس کی بنیاد رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ اور امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے رکھی تھی اور جسے قائد الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن ثانی لدھیانویؒ اپنے خون جگر سے سینچا تھا۔ انہوں نے کہا کہ آج بھی احرار کا شمار ان جماعتوں میں ہوتا ہے جو فتنۂ قادیانیت کے خلاف صف اول میں ملت اسلامیہ کی رہنمائی کررہے ہیں اور مظلوموں کے حق میں ظالم حکومتوں کے آنکھوں میں آنکھ ڈال کر بات کررہی ہے۔

محمد فرقان نے فرمایا کہ ہم نومنتخب صدر احرار مولانا عثمان لدھیانوی کو جہاں مبارکباد پیش کرتے ہیں وہیں مجلس احرار کی اراکین کا اس حسن انتخاب پر شکریہ ادا کرتے ہیں۔ نیز امید کرتے ہیں کہ مولانا عثمان لدھیانوی کی قیادت میں مجلس احرار اسلام ہند مزید مضبوط و مستحکم اور وسیع ہوگا۔

دارالعلوم دیوبند کی ویب سائٹ کی سروس کو معطل کرنیکا مطالبہ

عالمی شہرت یافتہ دینی دانش گاہ اور ہندستان کی آزادی میں نمایاں کردار ادا کرنے والا دارالعلوم دیوبند ہمیشہ کسی نہ کسی وجہ سے سرخیوں میں رہتا ہے۔ اس مرتبہ دارالعلوم دیوبند کو یہاں سے جاری ہونے والے فتوؤں کی بنیاد پر نشانہ بنا کر ادارہ کی ویب سائٹ پر موجود کچھ فتوؤں کو ملکی قوانین کے خلاف قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف حکومت سے کارروائی کرنے اور مذکورہ مواد کو ویب سائٹ سے ہٹائے جانے تک ویب سائٹ کی سروس بھی معطل کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی بنارسی کا کہنا ہے کہ ابھی ہمیں مذکورہ نوٹس کی کاپی نہیں ملی ہے، نوٹس ملنے پر اس کا جائزہ لے کر قانونی جواب دیا جائے گا۔

واضح ہو کہ حقوق اطفال کا حوالہ دیتے ہوئے ایک شکایت کنندہ نے دارالعلوم کے شعبہ دارالافتاء کے کچھ فتاویٰ کو غیر قانونی گردانتے ہوئے ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی شروع کردی ہے۔ اسی ضمن میں متبنّٰی کے فقہی مسئلہ پر دارالعلوم دیوبند کی جانب سے دیئے گئے فتاویٰ کے سلسلہ میں نیشنل کمیشن فار پروٹیکشن آف چائلڈ رائٹس (این سی پی سی آر) نے ایک شکایت کے نتیجہ میں سہارنپور کے ضلع مجسٹریٹ کو ایک وضاحتی خط جاری کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس قسم کے فتاویٰ ملک کے قانون کے منافی ہیں۔ اس پر نوٹس لیا جانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں بچوں کے حقوق سے وابستہ ادارہ نے ریاست کے چیف سکریٹری سے کہا ہے کہ جب تک فتاویٰ سے وابستہ ان مواد کو ہٹا نہیں دیا جاتا، تب تک ویب سائٹ کو بلاک کردیا جائے۔

دراصل دارالعلوم دیوبند کی جانب سے جاری ایک فتویٰ میں کہا گیا ہے کہ گود لیے گئے بچے کو اصل بچے جیسے حقوق نہیں مل سکتے۔ نیشنل کمیشن فار پروٹیکشن آف چائلڈ رائٹس کا کہنا ہے کہ اس طرح کے فتاوے قانون کے خلاف ہیں۔ یاد رہے کہ کسی شخص نے کمیشن میں یہ شکایت درج کرائی ہے کہ دارالعلوم دیوبند حقوق اطفال کے خلاف اپنی ویب سائٹ پر فتاویٰ جاری کررہا ہے جو کہ غیر قانونی ہے، شکایت کنندہ نے دعویٰ کیا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کہتا ہے کہ بچہ گود لینا غیر قانونی نہیں ہے لیکن شریعت اسلامی کی روشنی میں گود لیا بچہ وراثت میں حقدار نہیں ہوگا اور بعد بلوغت اس سے شرعی پردہ بھی ضروری ہوگا۔ کمیشن نے اس شکایت کا نوٹس لیا ہے اور کہا ہے کہ اس طرح کے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند سے جاری ہوتے ہیں کہ اسکول کا نصاب تعلیم، کالج یونیفارم، غیر اسلامی ماحول میں بچے کی تعلیم اور مخلوط تعلیم نسواں جیسے متعدد موضوعات قابل اعتراض ہیں۔ شکایت میں مزید کہا گیا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ اساتذہ کو اس بات کا حق دیتے ہیں کہ وہ بچوں کو جسمانی سزا دے سکیں جبکہ آر ٹی آئی قانون ۲۰۰۹ء کے تحت تعلیمی اداروں میں بچوں کو ایذا رسانی ممنوع ہے۔ کمیشن نے مزید کہا ہے کہ عوام الناس کو اس قسم کی معلومات فراہم کرنا جرم کرنے کی ترغیب کے زمرے میں ہے۔ کمیشن نے کہا ہے کہ یہ قانون کے ذریعہ طے شدہ ضابطوں کی خلاف ورزی ہے، کمیشن نے سہارنپور کے ضلع مجسٹریٹ کو اس سلسلہ میں نوٹس بھیج کر ضروری کارروائی کیے جانے کی ہدایت کی ہے۔ اس سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی بنارسی نے کہا کہ ہنوز کمیشن یا ضلع انتظامیہ کی جانب سے اس سلسلہ میں کوئی نوٹس دارالعلوم کو موصول نہیں ہوا ہے اور نہ ہی دیگر معتبر ذرائع سے اس مبینہ نوٹس کی تفصیلات ہی موصول ہوئی ہیں اس لیے ادارہ اس پر کوئی حتمی تبصرہ نہیں کرسکتا، نوٹس مل جانے کے بعد اس کے مشمولات پر دستورِ ہند اور مذہبی آزادی کی روشنی میں غور وخوض کیا جائے گا، اس کے بعد ہی کمیشن کے اقدام پر کوئی تبصرہ کیا جاسکتا ہے البتہ دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ شریعت اسلامی کی روشنی میں مستفتی کی طلب پر دیئے جاتے ہیں۔

مراسلات

ادارہ کا مراسلہ نگار کی رائے سے اتفاق ضروری نہیں

ہندستان مشترکہ ثقافتی اقدار کی سرزمین

مکرمی! پی آر سی کی ایک حالیہ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ ہندستان میں سب سے بڑے مذاہب کے پیروکاروں میں سے کم از کم تین چوتھائی (ہندو، مسلم، عیسائی، سکھ، بدھ اور جین) مذہب کو اپنی زندگی میں بہت اہم سمجھتے ہیں۔ ان میں سے تین چوتھائی سے زیادہ اپنے مذہب اور اس کے طریقوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں اور بودھ مذہب کے سوا تمام بڑے مذاہب کے پیروکاروں میں سے ۵۰ فیصد سے زیادہ روزانہ عبادت کرتے ہیں۔ ہندستان میں رہنے والے ہندوؤں میں سے ۸۴ فیصد ہندو، ۹۱ فیصد مسلمان، ۷۶ فیصد عیسائی، ۸۴ فیصد سکھ، ۸۷ فیصد بودھ اور ۸۹ فیصد جین مذہب کو اپنی زندگی میں بہت اہم سمجھتے ہیں۔ وہیں ۵۹ فیصد ہندو، ۶۶ فیصد مسلمان، ۷۷ فیصد عیسائی، ۴۵ فیصد سکھ، ۳۸ فیصد مسلمان، ۷۷ فیصد عیسائی، ۸۹ فیصد سکھ، ۸۱ فیصد بودھ اور ۸۳ فیصد جین اپنے مذہبی اور اس کے طریقوں کے بارے میں علم رکھتے ہیں۔ اپنے مذہب پر اس قدر پختہ یقین اور مذہبی علیحدگی کی شدید خواہش کے ساتھ ہندستانی ثقافت کے بارے میں کم علم رکھنے والا ایک بیرونی شخص ہندستان کو ایک منقسم ملک تصور کرے گا جس میں بہت کم مشترک اقدار ہیں۔ پی آر سی کی جانب سے نومبر ۲۰۱۹ء سے مارچ ۲۰۲۰ء کے درمیان کیے گئے ایک سروے نے عوامی تصور کے بالکل برعکس کچھ انکشاف کیا۔ ہندستان کے متنوع کردہ مذہبی خطوط کو پار کرتے ہوئے حب الوطنی کے جذبات، ثقافتی اقدار اور کچھ مذہبی عقائد کا اشتراک کرتے ہیں۔ تحقیق کے دوران سب سے اچھی بات یہ تھی کہ دو تین سے زیادہ ہندستانی بلا مذہبی تفریق کے یہ کہتے ہیں انھیں ہندستانی ہونے پر بہت فخر ہے اور ان میں سے بیشتر اس بات پر متفق ہیں کہ ہندستانی ثقافت دوسروں سے برتر ہے۔ مثال کے طور پر تقریباً ۹۰ فیصد ہندو، مسلمان، بدھ اور جین کہتے ہیں کہ بزرگوں کا احترام ان کی مذہبی شناخت کے لیے بہت اہم ہے۔ یہ ایک خصوصیت ہے جو عام طور پر ہندستانیوں میں پائی جاتی ہے۔ زیادہ تر مغربی یوروپی ممالک کی نمائندگی ایسے لوگوں سے ہوتی ہے جو ایک جیسی روایت اور ایک ہی مذہب (چند کو چھوڑ کر) بین الاقوامی سرحدوں سے وقفے وقفے سے متعین ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ہندستان جغرافیائی خطے کے وسیع علاقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ جیسا کہ پی آر سی کے ذریعہ پتہ چلا ہے ہندستان کے اقلیتی گروہ اکثر ایسے طریقوں میں مشغول رہتے ہیں جو ہندو روایت سے زیادہ قریب سے وابستہ ہوتے ہیں جتنا مشکل ہے یقین کرنے کے لیے 'بندی' جو زیادہ تر ہندو شادی شدہ خواتین پہنتی ہیں، ہندستان کے دیگر بڑے مذاہب کی شادی شدہ خواتین بھی استعمال کرتی ہیں جن میں مسلمان، سکھ اور عیسائی شامل ہی۔ یہی نہیں ہندستان میں مسلمان ہندوؤں کی طرح کہتے ہیں کہ وہ کرم پر یقین رکھتے ہیں۔ جب مذہبی تہوار منانے کی بات آتی ہے تو ہندستان ایک بہترین ملک مانا جاتا ہے۔ دیوالی اکثر بھارت میں شمالی ہند میں منائے جانے والے تہواروں میں سے ایک ہے۔ ۹۵ فیصد ہندوؤں کے علاوہ ۲۱ فیصد عیسائی اور ۲۰ فیصد مسلمان دیوالی مناتے ہیں یہ ایک ہندو تہوار ہے جو کہ رام کے ایودھیا واپسی کا جشن ہے۔ دیوالی منانا خاص طور پر مغرب کے مسلمانوں میں عام ہے، جہاں ۳۹ فیصد کہتے ہیں کہ وہ اس تہوار کو مناتے ہیں۔ اسی طرح ہندو بھی مسلم اور عیسائی تہوار مناتے ہیں۔ ۷ فیصد ہندستانی ہندو کہتے ہیں کہ وہ مسلم تہوار عید مناتے ہیں اور ۱۷ فیصد کرسمس مناتے ہیں۔ کچھ واقعات کو ٹی آر پی بڑھانے کے لیے میڈیا کے ذریعہ فرقہ وارانہ رنگ دیا جاتا ہے۔ رائے قائم کرنے سے پہلے دانشوران کو دستیاب حقائق پر مبنی حقیقت کی جانچ کرنی چاہیے۔ (یقینی طور پر سوشل میڈیا پر) جیسا کہ حالیہ تحقیق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ سچ اکثر عوامی تصور کے خلاف ہوتا ہے۔

سلطان احمد، جعفرآبادٹ دہلی-۳۵

اخلاقی قدروں کا زوال اور اس کا حل

مکرمی! کسی بھی معاشرے کی ترقی اور پستی کا انحصار اس میں رہنے والے افراد کی تعلیم وتہذیب اور اخلاقی قدروں پر ہوتا ہے، جب تک معاشرے میں اخلاقی قدروں کا پاس ولحاظ رکھا جاتا ہے، اس وقت تک معاشرہ ترقی کی شاہراہوں پر گامزن رہتا ہے۔ معاشرے میں امن وامان اور باہم محبت ومؤدت برقرار رہتی ہے لیکن اخلاقی قدروں کے زوال کے بعد معاشرے میں سینکڑوں برائیاں جنم لینے لگتی ہیں۔ دور حاضر میں اگر معاشرے پر سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسا کونسا گناہ ہے جو ہمارے معاشرے میں عام نہیں، ہر شخص دوسرے کے خون کا پیاسا ہے، یہاں تک کہ ایک حقیقی بھائی دوسرے بھائی کی ترقی کو نہیں دیکھ سکتا اور اس کی کامیابی کو اپنے لیے باعث شرم وعار سمجھتا ہے اور اسے نقصان پہنچانے کے لیے ہر طرح کی شیطانی چالیں چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہمارے پڑوسی ہمارے بغل میں رہ کر غربت وافلاس کی وجہ سے نہ جانے کتنی صعوبتیں جھیلتے ہیں لیکن بحثیت پڑوسی اس کی خیریت دریافت کرنے اور اس کی مدد کرنے میں بھی ہم اپنی بے عزتی محسوس کرتے ہیں اور اگر اسے کبھی کچھ دینا بھی ہوتا ہے تو ہم اس کی عزت نفس کو مجروح کرکے دیتے ہیں۔ مدد کرکے جتاتے ہیں، ہمارے معاشرے میں نہ جانے کتنی جوان لڑکیاں غربت کے باعث اپنے باپ کے گھر گھٹ گھٹ کر زندگی گزار رہی ہیں، کیونکہ نکاح کو اتنا مشکل بنا دیا ہے کہ کسی غریب کی بیٹا کا گھر آسانی سے نہیں بس سکتا لہٰذا نوجوانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ نکاح کو آسان بنائیں، جہیز کی رسم کو ختم کریں تا کہ غریب ومفلس بچیاں بھی اچھی اور پرسکون زندگی گزار سکیں۔ کیا ایک مسلمان اور مالدار ہونے کے ناطے ہمارے امراء کا یہ فریضہ نہیں بنتا کہ ان بے بس ولاچار بچیوں کا سہارا بنیں۔ دراصل ہم اپنی اخلاقی قدروں کو بلند کرنے کے بارے میں سوچتے ہی نہیں۔

دوست، احباب اور رشتے داروں کی خبر گیری کرنے کا عمل ہم سے رخصت ہوتا جارہا ہے۔ ہم اپنے مومن بھائی سے ملنا نہیں چاہتے، اگر ملاقات کرتے بھی ہیں تو چہرے پر مومنانہ مسکراہٹ اور دل میں حسد، کینہ، بغض وعداوت کے ساتھ جبکہ ہمارا اخلاق یہ ہونا چاہیے کہ ہم ہر ایک سے کشادہ روئی سے ملیں۔ خیریت پوچھیں اور ان کی دلجوئی کریں لیکن اگر ہم اپنے حالات کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ ہم اخلاقی طور پر نہایت ہی پست اور کمزور ہو چکے ہیں۔ معذرت کے ساتھ میں اپنی یہ بات رکھ رہا ہوں کہ اب تو ہمارا حال یہ ہے کہ کل تک جو اغیار ہمارے اخلاق وکردار سے متاثر ہوکر ہم سے قریب ہوتے تھے، پھر رفتہ رفتہ ہماری نرم گوئی اور متانت وسنجیدگی سے ہمارے مقدس مذہب سے وابستہ ہوکر اسلام کی پناہ میں آجایا کرتے تھے، آج وہی ہماری بداخلاقیوں اور ہمارے معاشرے میں باہم انتشار اور تناؤ کے پیش نظر (باقی ص۱۴ پر)

ALJAMIAT (URDU WEEKLY) NEW DELHI
Publishing Date: 14 January 2022
Postal Registration No. DL(C)-01/1267/2021-23
Posting Days MON. TUE. at N.D.P.S.O. New Delhi
R.N.I. 38985/82

منظر پس منظر ...عارف عزیز، بھوپال

• ہندستان میں جمہوریت کا استحکام • جمہوریت کے حقیقی محافظ کون؟

دُنیا کے بااثر ملکوں میں جمہوریت کا انحطاط

ہندستان میں جمہوریت کا استحکام

ہندوستان جیسے زیرِ ترقی اور مختلف تضادات کے حامل ملک میں پچاس سال تک پارلیمنٹ کا کام کرتے رہنا اور اس کے تحت جمہوریت و جمہوری روایات کا برقرار رہنا کسی معجزے سے کم نہیں ہے جبکہ ملک کے مختلف حصوں اور علاقوں میں دوری پہلے سے بڑھی ہے، امیر وغریب کے فرق میں بھی اضافہ ہوا ہے اور سیاسی شعبدہ بازی کے طفیل یہاں ایسی پارٹیوں کو طاقت و برتری ملتی رہی ہے جنہیں ملک اور اس کی جمہوریت سے زیادہ اپنی پالیسی و پروگرام کو بروئے کار لانے کی فکر ہے، اس عرصہ میں تمام تر دعوؤں کے باوجود نہ تو تعلیم کو کوئی واضح سمت مل سکی، نہ دوسرے اہم میدانوں میں قابلِ اطمینان کام انجام پاسکے، اس کے بجائے بدعنوانی

> **ملک کے وزیر اعظم خواہ کتنی ہی طاقت سے یہ نعرہ لگائیں کہ ہندوستان کی جمہوریت کو کوئی خطرہ نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جمہوری اداروں کا جس طرح زوال ہورہا ہے، ان کی کارکردگی کا معیار گررہا ہے، عوامی مفاد بالخصوص کمزوروں اور اقلیتوں کو جارح ہندو فرقہ پرستی جس طرح نشانہ بنارہی ہے اس کے پیش نظر صورتحال قطعی اطمینان بخش نظر نہیں آتی۔**

کا بول بالا ہوا ہے۔

جمہوریت کے اس تحفظ میں سب سے اہم کردار مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے اس طریقے نے ادا کیا جس کے تحت عوامی احتجاج کے پرامن طریقہ سے ملک نے آزادی حاصل کی، اس طرح جمہوریت کو جس اہم بنیاد کی ضرورت تھی وہ اسے اول مرحلہ میں ہی فراہم ہوگئی، اس کے برخلاف ہندوستان نے تشدد کی راہ سے آزادی حاصل کی ہوتی تو یہاں جمہوریت کسی بھی وقت آمریت میں تبدیل ہوسکتی تھی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مہاتما گاندھی کی قیادت میں انڈین نیشنل کانگریس نے ایک ایسی تنظیم کی حیثیت حاصل کرلی جس کے شہروں سے لیکر دیہی علاقوں تک لاکھوں کارکن سرگرم عمل تھے، اس طرح جس وقت آزادی ملی، اس وقت کانگریس وہ جماعت بن گئی جو ملک کو جمہوریت کی راہ پر گامزن رکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی، اس کے علاوہ اپنی تنظیمی ساخت کے لحاظ سے نیچے سے اوپر کی طرف جاتی تھی اور سیاسی کارکنوں کی تربیت کا بہت بڑا وسیلہ تھی، پرانی نسل کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایسے متعدد مباحثے یاد ہوں گے جن میں کانگریس کے نوجوان اور پرجوش ارکان نے نہ صرف جواہر لال نہرو، سردار پٹیل بلکہ مہاتما گاندھی کے خیالات و پروگرام کو ہدف تنقید بنانے کی جرأت کی خود گاندھی جی نے اس پر جس برداشت کا مظاہرہ کیا، وہی جمہوریت کا سب سے بڑا سبق تھا، جس میں اختلافِ رائے کی مکمل آزادی اور اس کے احترام کا جذبہ بھی شامل ہوتا تھا۔ اس سلسلہ کی تیسری بات جدوجہد آزاد کے آغاز سے لیکر آزادی کے حصول تک عوامی زندگی میں جمہوری اور اخلاقی قدروں کا باقی رہنا ہے، جس میں اصولوں کو اپنی مطلب براری کے لئے نہیں بلکہ اس کی اصل روح کے ساتھ اپنایا گیا تھا، مذکورہ تینوں سمتوں کے لحاظ سے آزادی کی سات دہائیوں کے دوران جو پستی آئی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور اس گراوٹ نے ملک میں جمہوریت کے مستقبل پر سوالیہ نشان قائم کردیا ہے۔

ملک کے وزیر اعظم خواہ کتنی ہی طاقت سے یہ نعرہ لگائیں کہ ہندوستان کی جمہوریت کو کوئی خطرہ نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جمہوری اداروں کا جس طرح زوال ہورہا ہے، ان کی کارکردگی کا معیار گررہا ہے، عوامی مفاد بالخصوص کمزوروں اور اقلیتوں کو جارح ہندو فرقہ پرستی جس طرح نشانہ بنارہی ہے اس کے پیش نظر صورت حال قطعی اطمینان بخش نظر نہیں آتی۔ آج پارلیمنٹ کو کام کرتے ہوئے ۶۹ سال ہورہے ہیں، اس موقع پر ضرورت ہے کہ سنہرے الفاظ وجذبات کا دریا بہانے کے بجائے، جمہور کے نمائندے اپنی جمہوریت کے سفر کا احتساب کریں اور یہ دیکھیں کہ اس عرصہ میں انہوں نے کیا کھویا کیا پایا ہے؟

اس عرصہ میں ملک نے مختلف میدانوں میں جو ترقی کی ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا خاص طور پر صنعتی ترقی کا اپنوں کو ہی نہیں پرایوں کو بھی اعتراف ہے، کل کارخانوں کا پھیلاؤ، سبز انقلاب اور ضرورت کی دیگر اشیاء کی دستیابی کے باوجود بھکمری بھی بڑھ رہی ہے، غریبی اور بیکاری برقرار ہے، نئی اقتصادی پالیسی نے رہی سہی کسر پوری کردی، گذشتہ گیارہ برسوں میں بیرونی سرمایہ کاری سے زیادہ ملک کی دولت باہر جانا شروع ہوگئی ہے، ترقی کی رفتار، صنعتی پیداوار بڑھ رہی ہے لیکن کسان بے چین و پریشان ہیں۔

یہ پارلیمنٹ کا کام ہے کہ وہ اس پر توجہ دے کر اصلاحِ حال کی فکر کرے، خصوصیت سے ملک میں جمہوریت اور اخلاقی قدروں کی آبیاری پر توجہ دے، تاکہ آج تک جو نقصان ہوا اس کا مداوا ہوسکے یہ کام صرف سیاست دانوں کا نہیں بلکہ ان سب کا ہے جو جمہوریت اور اس کے اصولوں پر یقین رکھتے ہیں اور ملک میں اس کی بقاء کو ناگزیر تصور کرتے ہیں۔

جمہوریت کے حقیقی محافظ کون؟

جمہوریت کی بنیاد انصاف ومساوات پر قائم ہے اور دکھ کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آزادی کے ۷۲ سال گزرجانے کے باوجود ہندوستان میں انصاف ومساوات کا حال بہتر نہیں ہوا، یہاں کے عوام کو کافی حدتک سیاسی جمہوریت تو میسر آگئی لیکن اس کو معاشی جمہوریت میں تبدیلی نہیں کیا جاسکا۔ حالانکہ ہر فلاحی جمہوری حکومت کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ جہاں حکومت کے کاروبار میں جمہوری اصولوں کو اپنائے وہیں ایسے اصول وقانون بھی بنائے جن میں ہر شہری کو اپنی ضرورت کے مطابق روزی وروٹی کمانے کا مساوی حق ہو، ملک کی دولت سے وہ فائدہ اٹھائے اور معاشی نظام ایسا ہو کہ وسائل چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائیں۔ مزدوروں کا استحصال نہ ہو، صنعتوں کے انتظام میں محنت کش برابر کے شریک ہوں، معذوروں اور عمر رسیدہ باشندوں کی سرکار مدد کرے، غریبوں کیلئے مفت قانونی مدد کا انتظام کیا جائے تاکہ وہ غریبی کی وجہ سے انصاف سے محروم نہ رہ جائیں، اس میں بھی سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ درج فہرست ذاتوں (دلتوں) درج فہرست اقوام (آدیباسیوں) اور دوسرے پچھڑے طبقات سے متعلق دستور کے ہدایتی اصولوں کو تشفی بخش طریقہ سے عملی جامہ پہنایا جائے اور گاؤں پنچایتوں نیز گھریلو صنعتوں کا قیام کرکے نشہ بندی اور ایسے ہی دوسرے عوامی بہبودی کے کام کئے جائیں لیکن گزشتہ ۲۶ برسوں سے جس اقتصادی کھلے پن کی پالیسی کو ہندوستان میں نافذ کیا جارہا ہے اس کے نتیجہ میں نہ صرف غریب پہلے سے زیادہ غریب اور امیر طبقہ پہلے سے زیادہ خوشحال ہورہا ہے بلکہ روزگار کے مواقع بھی گھٹ رہے ہیں، دولت مخصوص ہاتھوں تک محدود ہوتی جارہی ہے۔

یہ صورت حال ہماری اس فلاحی جمہوریت سے میل نہیں کھاتی جس کو بڑی چاہ سے یہاں اپنایا گیا تھا ایک اچھے جمہوری دستور کی خوبی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ زمانہ کی ترقیوں کا ساتھ دے اس لئے اس کو جامد نہیں ہونا چاہئے لیکن اتنا لچکدار بھی نہیں کہ مفاد عامہ کا ہی اُس میں لحاظ نہ ہو۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان کے اس جمہوری نظام پر چھائے مذکورہ خطرات اور ان کی سنگینی سے ہر باشعور ہندوستانی واقف ہو کیونکہ باخبر عوام ہی جمہوریت کے حقیقی محافظ ہوتے ہیں اور اُن کو درپیش مسائل صرف مقنّنہ (پارلیمنٹ) عدلیہ (سپریم کورٹ) اور انتظامیہ (سرکاری مشنری) سے حل نہیں ہوسکتے، خاص طور پر جمہوریت کا ایک بازو جب دوسرے کے دائرہ اختیار میں مداخلت کرتا ہے تو اِس سے پیدا ہونے والے مسائل اِن تینوں کے بجائے زیادہ بہتر طریقہ پر باخبر عوام ہی سلجھا سکتے ہیں، حکومت کا کاروبار چلانے والے کسی قائد یا اس کی پارٹی کی غیر ذمہ داری سے جب جمہوری نظام کو صدمہ پہونچتا ہے تو اس کو سنبھالنے والے عوام ہی ہوتے ہیں جیسا کہ ۱۹۷۵ء میں ہوا کہ ایک خود پسند وزیر اعظم کی طرف سے ملک میں ایمر جنسی لگا کر جمہوریت کا خون کرنے کی کوشش کی گئی تو اس وقت سپریم کورٹ، پارلیمنٹ یا سرکاری مشنری نے ہندوستانی جمہوریت کی حفاظت کا کام نہیں کیا بلکہ ملک کے ایک ذمہ دار سیاسی رہنما جے پرکاش نارائن نے عوام کو بیدار کیا اور الیکشن کے موقع پر متحد کرکے ایسی موثر پہل کی کہ ایمر جنسی کے حامی لیڈر اور ان کی پارٹی دونوں کو اقتدار سے باہر نکلنا پڑا لہذا اس میں کوئی

> **باخبر عوام ہی جمہوریت کے حقیقی محافظ ہوتے ہیں اور اُن کو درپیش مسائل صرف مقنّنہ عدلیہ اور انتظامیہ سے حل نہیں ہوسکتے، خاص طور پر جمہوریت کا ایک بازو جب دوسرے کے دائرہ اختیار میں مداخلت کرتا ہے تو اِس سے پیدا ہونے والے مسائل اِن تینوں کے بجائے زیادہ بہتر طریقہ پر باخبر عوام ہی سلجھا سکتے ہیں۔**

شک وشبہ نہیں ہونا چاہئے کہ باشعور عوام ہی جمہوریت کے حقیقی محافظ ہوتے ہیں۔

دُنیا کے بااثر ملکوں میں جمہوریت کا انحطاط

۲۰۲۱ء کی گلوبل اسٹیٹ آف ڈیموکریسی رپورٹ، جو جاری کی گئی، کے مطابق دنیا بھر میں جمہوریت میں گہرا انحطاط پایا جارہا ہے۔ اسٹاک ہوم میں قائم انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار ڈیموکریسی اینڈ الیکٹورل اسسٹینس کی رپورٹ میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ہندستان، امریکہ اور برازیل جو دنیا کی تین بڑی جمہوریتوں میں سے ہیں، ان ملکوں میں شامل ہیں جہاں اکثر عوامی حمایت کے ساتھ آمرانہ رجحانات کو زور پکڑتے دیکھا گیا ہے۔

اس نے مزید کہا کہ کووڈ-۱۹ وبائی مرض نے عالمی سطح پر جمہوری انحطاط کو تیز کردیا ہے۔ یہ نتائج

(باقی صـ۱۴ پر)

جمعیۃ علماء ھند کے محترم صدر اور دار العلوم دیوبند کے معاون مہتمم
امیر الھند حضرت مولانا قاری سیدمحمد عثمان صاحب منصورپوری نوراللہ مرقدہٗ
کی حیات و خدمات پر مشتمل
ہفت روزہ الجمعیۃ نئی دہلی کا
امیر الہند رابع نمبر
اپنی پوری شان کے ساتھ منظر عام پر آچکا ھے
صفحات: ۸۱۲ | سائز: ۲۳×۳۶/۸ | قیمت -/800
رابطہ ہفت روزہ الجمعیۃ، مدنی ہال (بیسمینٹ) ۱ بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی ۲
موبائل: 09868676489 — ای میل: aljamiatweekly@gmail.com

ہفت روزہ الجمعیۃ انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے، لاگ آن کریں: www.aljamiat.in
رابطہ: 9811198820 ای۔میل: aljamiatweekly@gmail.com

ضروری اعلان
آپ براہِ کرم مدتِ خریداری ختم ہوتے ہی زرِ سالانہ ارسال فرمائیں۔ خط وکتابت میں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
ادائیگی کے طریقے: 1 بذریعہ منی آرڈر
2 Paytm یا PhonePe کے ذریعہ 9811198820 پر
ALJAMIAT WEEKLY
3 آن لائن ادائیگی کیلئے بینک اکاؤنٹ کی تفصیل
A/c. 912010065151263
Axis Bank, Branch: Chitranjan Park, N.D.
IFS Code : UTIB0000430

شرح خریداری
سالانہ 200/-
ششماہی 100/-
فی پرچہ 5/-
پاکستان اور بنگلہ دیش کے لئے 2500/-
دیگر ممالک کے لئے 3000/-
رابطہ: منیجر ہفت روزہ الجمعیۃ مدنی ہال (بیسمینٹ) ۱ بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی ۲
فون: 011-23311455

Printed & Published by SHAKIL AHMAD SYED on behalf of Jamiat Trust Society printed at Shervani Art Printers, 1480, Qasimjan Street, Ballimaran, Delhi-6 and Published from Madani Hall,1, Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002. Editor MOHD. SALIM, Ph. No. 23311455, 23317729, Fax No.: 23316173.
Designing & Composing: HUMRAN AZMI